دارالعلوم دیوبند کا علمی دینی و اصلاحی

ماہنامہ

دارالعلوم

نگرانِ اعلیٰ

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصر

جلد ۶ — شمارہ ۳

دارالعلوم دیوبند کا دینی علمی
ماہنامہ

دارالعلوم

ربیع الاول ۱۳۷۳ھ مطابق دسمبر ۱۹۵۳ء

نگرانِ اعلیٰ
حضرت مولانا الحاج محمد طیب صاحب مدظلہ

(مدیر)
ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصر

رسالہ ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ پندرہ تاریخ کو شائع ہوگا

چندہ سالانہ
ہندوستان و پاکستان سے:- پانچ روپئے ۵/
ممالک غیر سے:- ۱۲ شلنگ، فی پرچہ ۸/

طابع و ناشر سید محمد ازہر شاہ قیصر مطبوعہ یونین پرنٹنگ پریس دہلی
مقام اشاعت دارالعلوم دیوبند

فہرستِ مضامین

کتبہ سید علی احمد کاتب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

ہمارے معاونین!

(۱) جناب ایوب، ڈی، اگوجی نے رنگون سے رسالہ کے لئے دو۲ خریدار فراہم کئے ہیں۔

(۲) مولٰنا محمد صاحب انوری نے لائل پور سے ایک قدیم اور دو۲ جدید خریداروں کا چندہ عنایت فرمایا ہے۔ خاکسار مدیر مولٰنا موصوف کے مسلسل تعاون و توجہ کا شکر گذار ہے۔

(۳) مولٰنا سید طفیل احمد صاحب نے گوجرہ ضلع لائل پور سے ایک خریدار کی پیشکش کی ہے۔

(۴) جناب منظور احمد خاں صاحب نے کراچی سے ایک خریدار بھیجا ہے۔

(۵) ہمارے رفیق خاص مولٰنا اسماعیل کڑوا صاحب نے بندر شیپس ٹون (جنوبی افریقہ) سے چھ پاؤنڈ کی رقم رسالہ "دار العلوم" کی امداد میں اپنے بعض احباب کی طرف سے عنایت فرمائی ہے، اس رقم سے نادار طلبہ کے نام رسالے جاری کئے جائیں گے۔

(۶) مولٰنا محمد حنیف صاحب افریقی نے میٹر سبرگ (جنوبی افریقہ) سے تین خریداروں کا چندہ عنایت فرمایا ہے جس میں سے ایک ڈیڑھ سال کے لئے اور ایک ڈھائی سال کے لئے خریدار بنے ہیں۔

(۷) شیخ گلزار محمد صاحب جالندھری نے ملتان سے ایک جدید خریدار کا چندہ بھیجا ہے۔

(۸) مولٰنا محمد س[illegible]ب نے ڈونگہ بونگہ سے ایک خریدار عنایت ف[illegible]

[illegible] نے سلہٹ سے دو۲ خریداروں کا چندہ عنایت فرمایا ہے

(۱۰) جناب محمد عمر صاحب ریواڑی والے نے ملتان سے دو۲ خریداروں کا چندہ بھیجا ہے۔

(۱۱) مولٰنا ایم، ایم، قاسمی نے ویراج پیٹ (کورگ) سے دو۲ خریدار رسالہ کے لئے عنایت فرمائے ہیں۔

(۱۲) رسالہ "دار العلوم" کے خاص محسن مولٰنا ابوسعید خدا بخش صاحب ملتانی تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں پاکستان کی اسلامی حکومت کے مہمان تھے چھ ماہ کے بعد مولٰنا بخیریت واپس تشریف لائے تو حسب دستور رسالہ کی توسیع اشاعت پر متوجہ ہوگئے، مولٰنا کی طرف سے ایک نئے خریدار کا چندہ وصول ہوا ہے۔

(۱۳) مولٰنا نذیر احمد صاحب طاہر نے منٹگمری سے اپنے ساتھ دو۲ جدید خریداروں کا چندہ عنایت فرمایا ہے۔ ادارہ موصوف کا شکر گذار ہے۔

(۱۴) مولٰنا انوار الحسن صاحب شیر کوٹی نے دو۲ خریدار رسالہ کے لئے عنایت فرمائے ہیں۔

کوائف دار العلوم کا بقیہ

مولٰنا تھانوی کی اہلیہ کا انتقال!

۱۲ نومبر کو دار العلوم میں حضرت مولٰنا تھانوی کی اہلیہ کبریٰ کے انتقال کی خبر آئی۔ جسے پورے دار العلوم نے بڑے رنج و ملال کے ساتھ سُنا۔

اسی دن دار العلوم میں قرآن شریف کا ختم ہوا۔ اور مرحومہ کے لئے دعائے مغفرت کی گئی۔

کوائفِ دارُالعلوم دیوبند

حضرت مہتمم صاحب مدظلہٗ کے سفر!

۹ر اکتوبر کو حضرت مہتمم صاحب مدظلہٗ سفر پر تشریف لے گئے، پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں دینی نصاب کی کمیٹی کے جلسوں میں شرکت فرمائی۔ علی گڑھ سے کان پور تشریف لے گئے جہاں بساطی بازار کے دیندار سوداگروں کی طرف سے سیرت النبیؐ کے جلسوں کا انتظام تھا۔ اکتوبر کے دوسرے ہفتہ میں کان پور کے جلسوں میں حضرت موصوف کے بیانات ہوئے، کانپور کی ایک تقریر میں آپ نے فرمایا کہ جہاں خُدا کا نام لیا جائے وہ جگہ واجب التعظیم ہے لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ دیوبندی اولیاء اللہ کی عظمت نہیں کرتے، لیکن میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ جہاں یہ حضرات مدفون ہیں، اُس جگہ کی عظمت کرنا بھی ہم ضروری جانتے ہیں۔ مگر اس کی عظمت ایک حد کے اندر کی جانی چاہیے ایسا نہو کہ ولی کو بڑھا کر نبی، اور نبی کو بڑھا کر خُدا بنا دیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ اُستاذ محترم حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے سات سال کی عمر سے لے کر اپنے آخری وقت تک دینیات کی کسی کتاب کو بھی بلا وضو نہیں چھُوا۔ جماعت دیوبند میں دینیات اور دینی علوم کی عظمت اس طرح کی جاتی ہے۔

۳۰ر اکتوبر کو حضرت موصوف ایک چند روزہ سفر پر تشریف لے گئے جو مدرسہ اسلامیہ جوکہاد ترائی (نیپال) مدرسہ سعیدیہ شاہجہانپور جلسۂ سیرت النبیؐ کان پور کی شرکت کے لئے تھا، ہر سہ مقامات کے ان جلسوں میں تقریریں فرمائی گئیں اور ۷ر نومبر کو اس سفر سے واپسی ہوئی۔

اِمدادی عطیات!

(۱) حاجی قاسم طیب صاحب ۱۷ المگین روڈ بمبئی نمبر ۱۱۔ ۵۰۰ روپے

(۲) عبداللہ بصام بدری بلڈنگ، ناگ دیوی اسٹریٹ بمبئی۔ ۲۰۰ ″

(۳) اے صالح محمد جامع مسجد۔ ۲۰۰ ″

(۴) محمد عبداللطیف ۶۵ اسماعیل کرتے روڈ ۳ ۲۰۰ ″

(۵) حاجی ابراہیم حاجی ۶۵ قاضی اسٹریٹ۔ ۲۰۰ ″

(۶) اسماعیل ابراہیم مہتا ارسکین روڈ کھتری چال۔ ۱۰۰ ″

سیٹھ محمد حسین توفیق نے بمبئی سے اُن کے علاوہ بعض اور حضرات کی طرف سے ۱۷۹۶ روپیہ کی رقم ارسال کی ہے۔

(۷) مولانا عبدالجبار صاحب ابوہری ہارون آباد ضلع بھاولنگر ریاست بھاولپور۔ بعض اہلِ خیر کی طرف سے۔ ۲۵ [illegible]

(۸) مولوی محمد ابراہیم صاحب جکڑالہ ضلع میانوالی۔ [illegible]

(۹) شیخ عبدالرحمٰن صاحب پروپرائٹر جالندھر کلاتھ ہاؤس بلاک ۳ سرگودھا۔ [illegible]

(۱۰) مولوی جان محمد صاحب مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول چک ۱۳۲ براستہ صادقیہ بھاولپور۔ ۴۰ [illegible]

(۱۱) حافظ محمد اسمٰعیل صاحب مدرس مدرسہ تعلیم القرآن گوجرہ (لائلپور) ۱۵ [illegible]

(۱۲) عطاء اللہ صاحب ڈپو ہولڈر، غلہ منڈی۔ گوجرہ ضلع لائل پور۔ ۱۰۰ [illegible]

(بقیہ کوائف ص۳ پر)

چودھویں قسط [۱۴] :-

فلسفۂ نعمت و مصیبت

حضرت مولٰنا محمد طیب صاحب مدظلہ

خرق عادت کے طور پر عذاب الٰہی

اگر اس پر بھی اس جرائم پیشہ اور عصیان شعار قوم پر ندامت و خجلت اور توبہ و استغفار کے آثار ظاہر نہوں اور وہ ان عادی اسباب کے ضمن میں اپنی ان انتہائی سزاؤں پر بھی عبرت نہ پکڑے بلکہ کائنات کی ہر چیز سے مستفید ہو کر اس سے پیدا شدہ قوت و طاقت کو جرائم ہی میں استعمال کرتی رہے جس سے اُس کی عیاشی۔ تن آسانی۔ شہوات و شبہات اور نخوت و انانیت ہی اُس کی جبلّت بن جائے تو پھر خرق عادۃ کے طور پر کائنات کے تمام قوائے ظاہر و باطن اور عالم کے تمام اجزاء و اعضاء خواہ وہ ذی عقل ہوں یا غیر ذوی العقول جمادات ہوں یا نباتات و حیوانات۔ عناصر ہوں یا موالید جو خود اُس کے ضمیر کا جزو اور اُس کی حیات کے لئے سہارا تھے اُس کے حق میں جلّاد بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں ؎

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند
با من و تو مُردہ با حق زندہ اند

یعنی قوموں کی یلغار اور تاخت و تاراج ہی نہیں جو انسان سے انسان پر پڑتی تھی۔ زمین کے زلزلے، آسمان کی سنگ باری۔ فضاؤں کی گرج۔ خلاؤں کی آتشین اور سموم ہوا، اور بحر و بر کے طوفان باد و باراں غرض زمین و آسمان اور جو خلاء کی ساری عدمی آفتیں بطور تعزیر و سزا اس قوم کے سر پر منڈلانے لگتی ہیں اور مجرموں کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے خواہ یہ بیک دم ہو جائے جسے خرق عادۃ کہیں گے، اور خواہ عادی اسباب کے ضمن میں بتدریج ایک دراز مدۃ اور قرن میں [illegible] اور رفتہ رفتہ طبعی اسباب و علل کے راستہ سے ایک دو یا دو چار صدی میں قوم کا یہ انجام بد دکھلایا جائے۔ فرق اتنا ہے کہ طبعی افعال کی بے اعتدالیوں پر یہ غیر معتدل آثار طبعی رنگ میں مرتب ہوتے تھے جیسا کہ مفصّل گذرا، اور عقل و شعور سے خلاف ورزی اور ڈھٹائی کے ساتھ قوم کے عدمی افعال پر یہ سزائیں شعور و ادراک کے ساتھ انتقام کے رنگ سے آتی ہیں، خواہ کئی صدیوں میں تکمیل پائیں۔

انتقام خداوندی کی نوعیت جرائم اور اُس کی دو قسمیں

البتہ یہ انتقام حسب نوعیت جرائم ہوتا ہے مثلاً اگر مجرم قوم کے جرائم کا منشاء کبر و نخوت ہے یعنی قوم افراط و مبالغہ اور چستی و مستعدی کے ساتھ حق کے مقابلہ اور تکذیب پر اُتر آئے۔ معارضۂ حق، "قتل انبیاء" قتل صلحاء اور حق و صداقت کو برملا دفن کر دینے کی ترکیبوں اور سازشوں کی کمر باندھ لے، کھُلے اسراف پر آمادہ ہو جائے خواہ اسراف جانی ہو یا اسرافِ مالی، تو اجزاء کائنات سے عذاب خداوندی بھی افراط ہی کے رنگ میں اُبھرے گا اور طوفانی شکل میں عناصر اربعہ وغیرہ اُبھر کر مجرم قوم کا غرور خاک میں ملا دیں گے۔ خواہ وہ طوفان باد و باراں ہو یا طوفان خاک و آتش۔ اور اگر ذنوب کا منشا سُستی و غفلت ہو، یعنی قوم بے عمل ہو کر عیش و عشرت کا شکار ہو جائے۔ شہوت پرستیوں میں غرقاب ہو، اور قانون عدل و حق اور اس پر عملی جد و جہد کو یکلخت ترک کر کے بدمست ہو جائے تو پھر عذاب الٰہی کے لئے بھی اجزاء کائنات کا تفریطی پہلو کھُلے گا، اور قوم کائناتی منافع سے اسی طرح محروم کر دی جائے گی جس طرح اُس نے اپنے کو عمل صالح سے محروم کر لیا تھا۔ غرض افراطی رنگ کے عذاب میں عناصر کائنات زیادتی کے ساتھ

ابھرتے ہیں اور تفریطی رنگ کے عذاب میں کمی اور نقص کے ساتھ گم ہو جاتے ہیں۔ پہلی صورت میں قوم اجزاءِ عالم کی مضرتوں کو بھگتتی ہے اس لئے اس عذاب کا حاصل خسران ہے اور دوسری صورت میں قوم عناصر وغیرہ کے منافع سے محروم ہو جاتی ہے، اس لئے اس عذاب کا حاصل حرمان ہے۔ اب یہ صرف علام الغیوب ہی جانتا ہے کہ کبر و نخوت کی کس کس نوع پر کس کس انداد کا طوفانی عذاب آتا ہے اور کسل و غفلت کی کس کس قسم پر کس انداز سے فقدانی عذاب مسلط ہوتا ہے۔ تاہم قرآن حکیم نے دونوں قسم کے عذابوں کی طرف اشارے فرمائے ہیں:-

آبی عذاب:-

پانی کا طوفانی عذاب قوم نوحؑ کی نخوت پر پانی کی زیادتی کا عذاب مسلط ہوا جو ضرر رسانی پر مشتمل تھا نہ کہ پانی سے محرومی کا۔

فاخذھم الطوفان وھم ظالمون ۵ — "تو ان کو طوفان نے آ دبایا، اور وہ تھے ظالموں میں سے۔"

اسی طرح قوم فرعون پر بھی پانی کا طوفانی ہی عذاب آیا نہ کہ فقدانی۔ فرمایا گیا:-

فارسلنا علیھم الطوفان (الآیہ) — "پس ہم نے ان پر طوفان بھیجا۔"

ایک جگہ اس ضرر رسانی سے جو پانی کے ذریعہ کی جاتی ہے ظالموں کو ڈرایا گیا جو طوفانی ہی عذاب کی دھمکی ہے نہ کہ فقدانی کی، فرمایا:-

واذا مسکم الضر فی البحر ضل من تدعون الا ایاہ۔ — "اور جب دریا میں تم کو کوئی تکلیف پہنچی ہے تو خدا کے سوا تمہارے سب معبود غائب ہو جاتے ہیں۔"

پانی کا فقدانی عذاب اس کے بالمقابل پانی کے نقصانی عذاب سے ڈرایا گیا جس میں پانی اور پانی کے منافع سلب کر لئے جاتے ہیں۔ فرمایا:-

قل ان اصبح ماءکم غوراً فمن یأتیکم بماءٍ معین؟ — "کہہ دیجئے کہ اچھا یہ بتلاؤ کہ اگر تمہارا پانی غائب ہو جائے تو وہ کون ہے جو تمہارے پاس سوت کا پانی لے آئے؟"

خاکی عذاب:-

خاک کا طوفانی عذاب یا مثلاً زمین کی ضرر رسانی یا طوفانیت یہ تھی کہ وہ آدمی کو نگل لے اور اس پر مسلط ہو جائے یعنی مجرم افراد یا اقوام اس میں دھنسا دیئے جائیں جیسے قارون کو بشخصہ دھنسایا گیا اور بعض اقوام کی بھری بھرائی بستیاں زمین برد کر دی گئیں یا زمینی اجزاء اس پر برس پڑیں اور ہر چہار طرف سے گھیر کر ختم کر دیں جیسے پتھر برسا دیئے جائیں چنانچہ قوم لوط پر آسمان سے پتھراؤ کیا گیا۔ یا قوم ابرھہ پر چڑیوں کے ذریعہ مہلک کنکریاں برسا دی گئیں اور انھیں ختم کر دیا گیا۔ زمین کے اسی افراطی عذاب کی طرف قرآن نے رہنمائی فرمائی:-

افأمنتم ان یخسف بکم جانب البر او یرسل علیکم حاصباً ثم لا تجدوا لکم وکیلاً — "تو کیا تم اس بات سے بے فکر ہو بیٹھے ہو کہ تم کو خشکی کی جانب میں لا کر زمین میں دھنسا دے یا بھیج دے تم پر آندھی پتھر برسانے والی پھر نہ پاؤ اپنا کوئی نگہبان۔"

خاک کا نقصانی عذاب دوسری صورت زمین کے نقصانی عذاب کی ہے کہ وہ اپنی جگہ چھوڑ کر اپنے منافع سے انسانوں کو محروم کر دے مثلاً ذات قرار رہنے اور اپنے مقر پر اس طرح جمے ہوئے رہنے کے کہ مخلوق اس پر ٹھہر سکے وہ اپنی جگہ سے ہٹ جائے جس سے مخلوق کا استقرار اور ٹھہراؤ جو زمین کی نفع رسانی تھی معدوم ہو جائے جسے زلزلہ کہتے ہیں، تو یہ نقصانی عذاب ہو گا جس کا ثمرہ حرمان ہے نہ کہ خسران۔ ارشاد ربانی ہے:-

ان اللہ یمسک السموات والارض ان تزولا ولئن زالتا ان امسکھما من احد من بعدہ انہ کان حلیماً غفوراً — "بے شک اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو گرنے سے روک رکھا ہے اور اگر یہ گرنے لگیں تو خدا کے بعد انھیں کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ بردبار اور بخشنے والا ہے۔"

ھوائی عذاب:-

ہوا کا طوفانی عذاب

یا مثلاً ہوا کا طوفانی عذاب یعنی ضرر رساں پہلو تو یہ ہے کہ وہ زور شور سے چلے اور حد اعتدال کو چھوڑ کر حد افراط میں آجائے جس کے تھپیڑوں سے مجرم قوم ہلاک ہوجائے اور اُس کی بستیاں اُلٹ جائیں جیسے قوم عاد ہلاک ہوئی۔

فاما عاد فاهلكوا بريح صرصر عاتية سخرها عليهم سبع ليال و ثمانية ايام حسوما فترى القوم فيها صرعى كانهم اعجاز نخل خاوية۔

"اور وہ جو عاد تھے سو برباد ہوئے ٹھنڈی سنسناٹی کی ہوا سے نکلی جائے ہاتھوں سے۔ مقرر کردیا اُسکو اُن پر سات رات اور آٹھ دن تک لگاتار۔ تو دیکھے کہ وہ لوگ اُس میں پچھڑ گئے گویا وہ ڈھنڈ ہیں کھجور کے کھوکھلے۔"

ہوا کا نقصانی عذاب

اور ہوا کا نقصانی یا فقدانی عذاب یہ ہے کہ وہ اپنے منافع انسانوں سے چھین لے۔ اور عدیم النفع بن جائے مثلاً چلنا بند کردے، گھونٹ ہوجائے، جہاز کھڑے کے کھڑے رہ جائیں، لوگوں کے سانس رُک جائیں اور انسان گھٹ گھٹ کر ختم ہوجائیں۔ ارشاد حق ہے:

ان يشأ يسكن الريح فيظللن رواكد على ظهره۔

آتشیں عذاب:-

آگ کا طوفانی عذاب

اسی طرح آگ کا طوفانی عذاب تو یہ ہے کہ وہ آتش فشاں پہاڑ بنکر اُبھر پڑے یا آبادیوں پر برس پڑے یا بجلی آگرے کہ وہ بھی آگ ہی ہے۔ یا بگولے آگ لئے ہوئے سروں پر منڈلانے لگیں۔ یا بادلوں میں سے انگارے برس جائیں یا بموں کے گولوں میں سے آتشیں ٹکڑے [illegible] گھیر لیں جس سے اموال و اولاد تباہ ہوجائیں۔ چنانچہ [illegible] کے تو یوں فرمایا کہ:-

فاصابها اعصار فيه نارٌ فاحترقت۔

"سو اُس باغ پر ایک بگولا آئے جس میں آگ ہو اور وہ باغ جلجائے"

اور بطور واقعہ کے قوم شعیب کے قصہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ اول اُن پر گرمی کی شدت مسلط ہوئی جو آگ برسنے کا پیش خیمہ تھا، پھر ایک ابر کے سائبان میں سے پانی کے بجائے آگ کے انگارے برسادئے گئے جس سے قوم جل کر خاکستر ہوگئی۔ ارشاد حق ہے:-

فاخذهم عذاب يوم الظُّلة۔

آگ کا نقصانی عذاب

آگ کا نقصانی عذاب یہ ہے کہ وہ گم ہوجائے اور اپنے منافع یعنی روشنی اور حرارت سے جانداروں کو محروم کردے۔ آگ کا سرچشمہ کہ جس سے کائنات کی حرارت قائم ہے اور آگ موجود اور روشن ہے سورج ہے۔ اگر وہ نکلنا چھوڑدے تو روشنی اور گرمی کہاں سے آئے گی اور نتیجہ یہ ہوگا کہ مخلوق برف کی طرح جم کر رہجائے گی۔ اس حرمانی عذاب کی طرف قرآن کریم نے اشارہ فرمایا:-

قل ارأيتم ان جعل الله عليكم الليل سرمدا الى يوم القيمة من اله غير الله يأتيكم بضياء؟ افلا تسمعون؟-

"کہئے کہ بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کے لئے قیامت تک رات ہی رہنے دے تو خدا کے سوا وہ کون معبود ہے جو تمہارے لئے روشنی کو لے آئے تو کیا تم (توحید کے ایسے صاف دلائل کو) سنتے نہیں؟"

غرض عناصر اربعہ کے ذریعہ عذاب آنے کی دو ہی صورتیں ہیں ایک طوفانی صورت ہے جس میں اُن کی زیادتی ضرر ہوجاتی ہے اور نقصانی صورت ہے جس میں اُن کی کمی یعنی سلب منافع کی آفت اُن کے منافع سے محروم کردیتی ہے۔ پس ایک خسرانی عذاب ہوتا ہے اور ایک حرمانی۔ اگر مجرم قوم کے ذنوب کا منشا ڈھٹائی اور کائنات کی نعمتوں کا جرائم میں مبالغہ کے ساتھ استعمال ہے تو ان عناصر سے عذاب الٰہی طوفانی رنگ میں آتا ہے اور بقدر ما انتفاع مضرتیں بھگتنی پڑتی ہیں اور اگر ذنوب کا منشا سستی و غفلت اور کاہلی و

تن آسانی ہے یعنی مجرم قوم نے سعی و عمل ہی کو ترک کر دیا ہے اور ان عناصر سے سرے سے کام لینا ہی سستی و کسل سے ترک کر دیا ہے تو ان عناصر سے عذاب خداوندی نقصانی رنگ میں آتا ہے جس سے قوم بقدر کسل و غفلت اُن کے منافع سے اِسی طرح محروم کر دی جاتی ہے، جس طرح اُس نے اپنے کو سعی و عمل سے محروم کر لیا تھا۔

غرض جس طرح آخرۃ کا معاملہ قانونِ مجازاۃ پر دائر ہے ایسے ہی دُنیا کا معاملہ قانونِ مکافات پر دائر ہے۔ اور جس طرح وہاں جزاء و عمل میں مناسبت رکھی گئی ہے اسی طرح یہاں بھی عمل اور ثمرات عمل میں یکسانی کی رعایت رکھی گئی ہے تاکہ جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا۔ کا یہاں اور وہاں پورا پورا ظہور ہو جائے۔ پس جس نوعیت کا تغیر آدمی اپنے نفس اور اپنے عمل میں کریگا، افراطی ہو یا تفریطی اُسی نوعیت کا تغیر اُس کے لئے جہانوں میں ہو جائے گا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ۔ "بے شک اللہ تعالےٰ قوم کی حالت اُس وقت تک نہیں بدلتا جبتک وہ اپنی حالت خود نہ بدلے۔"

بہرحال اس سے واضح ہو گیا کہ جرائم کا انتقام انفسی بھی ہوتا ہے اور آفاقی بھی۔ اور آفاقی میں انسانوں کے ہاتھوں سے بھی ہوتا ہے اور عام اشیاء و کائنات یعنی عناصر اربعہ اور موالید ثلاثہ سے بھی۔

بہر دو صورت عالم کی یہ آفات خواہ تکوینی تغیر کی صورت سے آئیں یا انتقامی انداز سے وہ انسانی افعال کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ اگر افعال عیوب کی قسم سے ہیں یعنی طبعی اور عقلی دائرہ کی بداعمالیاں ہیں جنمیں بے اعتدالی ظہور میں آتی ہے کسی امر و نہی کی خلاف ورزی نہیں ہوتی تو آفات تکوینی تغیرات کے رنگ سے اُن پر مرتب ہوتی ہیں۔ اور اگر شرعی دائرہ کی ہیں جن میں ایک نازل شدہ قانون (شریعت) کی خلاف ورزی شامل ہو تو آفات انتقامی رنگ سے اُمنڈتی ہیں خواہ وہ انسان کے اندر سے اُبھریں یا باہر سے ٹوٹ پڑیں۔

بہر دو صورت یہ سلبی آفات انسان ہی کے عدمی افعال کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ اور ٹھیک ٹھیک قانون مکافات کا یہ ایک قدرتی عمل ہوتا ہے کہ جیسا کروگے ویسا ہی تمہارے آگے آجائے گا۔ اِسی کی طرف قرآنِ حکیم نے مختلف نوعیتوں سے اشارے فرمائے۔ کہیں فرمایا کہ اگر تم سعی و عمل اور جد و جہد سے حق کے کاموں کے مددگار بنجاؤگے تو حق تمہارا مددگار ہو جائے گا۔

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ۔ "اگر تم اللہ (کے دین) کی نصرت کروگے تو خُدا تمہاری امداد کریگا۔"

اور اگر تم نے حق کا مقابلہ کیا خواہ ترک حق سے خواہ معارضۂ حق سے اور اصل سے ہٹ کر بے اصل کی طرف لوٹ پڑے تو حق بھی تمہیں سزا دینے کی طرف لوٹ پڑے گا۔

وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ۔ "اور اگر تم پھر وہی کام کروگے تو ہم بھی پھر وہی کام کریں گے۔"

حتی کہ معافی کے بعد بھی اگر یہی حرکت ہوئی تو اُدھر سے پھر اعادۂ عذاب کی حرکت ہوگی۔

عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا۔ "عجب نہیں کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے اور اگر تم پھر وہی شرارت کروگے، تو ہم بھی پھر وہی کریں گے۔"

جیسا معاملہ حق اور کائنات حق کے ساتھ کیا جائے گا ویسا ہی معاملہ حق اور کائنات حق کی طرف سے اُس کے ساتھ ہوگا۔ کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ۔

اِنسانی افعال سے کائنات میں تغیّر آجانے کی کیفیت

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے اچھے بُرے افعال سے خود انسان میں تغیّر پیدا ہونا، اور بصورت نعمت و مصیبت نُمایاں ہو جانا تو واضح ہو گیا۔ لیکن انسانی افعال سے بیرونی کائنات میں تغیر آجانا، جیسے انسانی جرائم سے زلزلوں کا آنا، یا طوفان کا اُمنڈ آنا، اور انسانی شرارتوں سے زمین میں طوفانی یا نقصانی حرکت پیدا ہو جانا ہنوز معرضِ خفاء میں ہے۔ آخر یہ زمین و آسمان کی اشیاء انسانی حرکات سے کیا رابطہ رکھتی ہیں کہ اُن کے سرزد ہوتے ہی یہ جہانی آفتیں نمایاں ہونے لگیں؟ سوائے یوں سمجھیے کے ہر دو نوع افعال عُیوب اور ذُنوب سے جہان میں بھی

پہلی قسط:-

اسلام میں حکومت کا درجہ

(مولانا حکیم محمد اسحاق ندوی ندوۃ العلماء لکھنؤ)

ہر شئے کی پیدائش ایک مناسب فضاء اور سازگار ماحول کو چاہتی ہے مسائل بھی عموماً اسی قاعدے کی پابندی کرتے ہیں اور ہر مسئلہ ایک مناسب و مخصوص نفسیاتی و ذہنی فضاء میں پیدا ہوتا ہے۔ آئندہ سطروں میں جس مسئلہ پر مجھے بحث کرنا ہے پہلے اس کے پس منظر کو دیکھ لیجئے اور اس نفسیاتی فضاء پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ جس میں وہ پیدا ہوا ہے تاکہ نفس مسئلہ کو سمجھنے اور اُس پر غور کرنے میں سہولت ہو اور تصویر کے خدوخال اچھی طرح نمایاں ہوکر سامنے آجائیں۔

نفسیاتی فضاء

سُلطانِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب اس عالم سے تشریف لے گئے ہیں تو کتاب و سنّت کے ساتھ ایک باعظمت سلطنت بھی مسلمانوں کے ہاتھوں میں دے کر تشریف لے گئے تھے۔ اُس دور کے بعد صدیوں تک سلطنت مسلمانوں کے گھر کی باندی رہی اور شاید غیروں کی محکومی گوارا کرنے کا تصور بھی مسلمانوں کے ذہن میں نہ آیا ہو۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہماری بداعمالیوں نے اس حالت کو بدل دیا اور مختلف مقامات پر مسلمانوں کو غیروں کی محکومیت کا جوا اپنی گردن پر رکھنا پڑا۔

سرزمینِ ہند میں یہ دورِ حکومت بہت طویل رہا۔ اس لئے صدیوں کی اس محکومانہ فضاء نے مسلمانوں کے مزاج کو آہستہ آہستہ اپنے لئے سازگار بنانا شروع کردیا۔ اور حکومت و سلطنت کے متعلق اس کے صدیوں کے تصورات میں تزلزل پیدا ہونا شروع ہوگیا۔ اسی نفسیاتی فضاء اور ماحول کا نتیجہ یہ مسئلہ ہے کہ اسلام میں حکومت کا کیا درجہ ہے؟

اس مسئلہ کو نہ تو شریعت اسلامیہ نے مبہم چھوڑا ہے اور نہ ہمارے اسلاف نے اسکی تشریح و تفصیل میں کوتاہی کی ہے لیکن محکومانہ فضاء کا اثر ملاحظہ ہو کہ آج اس مسئلہ پر اس طرح گفتگو ہوتی ہے جیسے یہ بالکل نیا مسئلہ ہے۔ جسے نئے سرے سے قرآن و حدیث میں تلاش کرتا ہے۔ اور نیا اجتہاد ہی اس مسئلہ کو حل کرسکتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا جواب تشریح و تفصیل کے ساتھ دیا جاچکا ہے اور کتاب و سنت کی روشنی میں ہمارے اسلاف جو متفقہ جواب اس کا دے چکے ہیں اس کے علاوہ کسی دوسرے حل کی تلاش کرنا عبث اور اضاعتِ وقت ہے البتہ مزید انکشاف و تسکین کے لئے ایسا کرسکتے ہیں کہ ان کے جواب کو کتاب و سنّت کے معیار پر دوبارہ جانچ لیں۔

سوال کا تجزیہ

مندرجہ بالا سوال درحقیقت اجزاء ذیل پر مشتمل ہے:-

(۱) تفصیلی احکام سے قطع نظر کیا خود حکومت اسلامیہ کا قائم کرنا بھی کوئی شرعی و دینی حکم ہے؟

(۲) اگر یہ شرعی حکم ہے تو اس کا کیا درجہ ہے؟ فرض؟ واجب؟ مستحب؟ ان میں سے کس قسم میں داخل ہے؟

(۳) اگر یہ کوئی شرعی حکم نہیں ہے بلکہ ایک دنیاوی مباح کام ہے تو اس کی اباحت کبھی فرضیت و وجوب کا درجہ بھی حاصل کرسکتی ہے یا نہیں؟

(۴) دونوں صورتوں میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اس کام کے لئے دعوت دینا فی نفسہٖ جائز ہے یا نہیں؟

(۵) احکام شرعیہ کی دو قسمیں ہیں احکام مقصودہ و احکام غیر مقصودہ

اقامت حکومت اسلامیہ اگر کوئی حکم شرعی ہے تو ان دونوں قسموں میں سے کس قسم میں شامل ہے؟

سوال کی یہ خورد بینی تحلیل اس لئے کی گئی ہے کہ مسئلہ کے کُل پہلو سامنے آجائیں اور اس بارے میں جو غلطیاں ہوتی ہیں انہیں آسانی کے ساتھ نمایاں کیا جاسکے۔

افراط و تفریط

اس مضمون کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اسلام میں حکومت کا جو صحیح درجہ ہے اسے کتاب و سنت اور تشریحات سلف کی روشنی میں واضح کر دیا جائے اور اس سلسلہ میں جو غلط فہمیاں اہل علم کے ایک اچھے خاصے گروہ میں پیدا ہو گئی ہیں انھیں دُور کر دیا جائے۔ یہاں اس مسئلہ سے بالکل بحث نہیں ہے کہ موجودہ دور میں اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش مناسب اور صحیح اقدام ہے یا نہیں؟ نہ کسی تحریک کی مخالفت یا موافقت یہاں مقصود ہے۔ اس لئے ناظرین کو مضمون صرف اس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے کہ وہ ایک مسئلہ شرعی کی علمی تحقیق ہے نہ کہ کسی تحریک کی تائید یا تنقید۔ مضمون لکھنے کا محرک بھی یہی مشاہدہ ہے کہ اس مسئلہ میں موجودہ دَور میں ایک گروہ نے افراط کا پہلو اختیار کیا ہے اور دوسرے نے تفریط کا۔ ایسے حضرات کی تعداد بہت قلیل ہے۔ جو صحیح مسلک کا واضح تصوّر رکھتے ہیں اور جو ہیں بھی انہوں نے اس مسئلہ میں سکوت اختیار کیا ہے۔ کم از کم میرے علم میں کسی نے ابتک اسکی توضیح نہیں کی ہے اس لئے اس کی وضاحت ضروری معلوم ہوئی تاکہ دین کے اس اہم مسئلہ پر پردے نہ پڑ جائیں اور مسلمان غلط راستوں کو نہ اختیار کرلیں۔

پہلا جواب:

چودھویں صدی ہجری اس اعتبار سے ایک ممتاز درجہ رکھتی ہو کہ اس میں مسلمانوں کو اپنا بھولا ہوا سبق پھر یاد آنے لگا۔ اور سیکولرزم، نیشنلزم وغیرہ کے مقابلہ میں ایک گروہ نے اسلامی حکومت کی دعوت بھی دینی شروع کر دی۔ یہ تحریک متعدد اسلامی ممالک میں پیدا ہوئی۔ اور ہندوستان کو بھی اس کا حصہ ملا۔ جب کسی حکم شرعی کی دعوت تحریک کے انداز میں دی جاتی ہے تو اس میں غلو تقریباً ناگزیر ہوتا ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی یہی ہوا۔ حامیانِ تحریک میں سے بعض حضرات درجہ افراط پر پہونچ گئے اور انہوں نے اس عملی حکم کو ایمان کا درجہ دیدیا۔ ان کے نزدیک جب تک لا الٰہ الا اللہ کی تفسیر ان الحکم الا للہ کے ساتھ نہ کی جائے اُس وقت تک ایمان ناقص رہتا ہے۔ گویا معبودیت و حاکمیت اُن کے نزدیک ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ ممکن ہے کہ محض زورِ بیان نے قلم کو حدود سے آگے بڑھا دیا ہو اور ان حضرات کا یہ مقصد نہو لیکن اُن کی تحریروں کو دیکھنے سے جو اثر مخاطب پر پڑتا ہے وہ یہی ہے کہ دین کا مقصد اور اُس کی رُوح صرف اقامتِ حکومت ہے اور دین کا ہر شعبہ درحقیقت اسی مقصد کی تحصیل تکمیل کا ذریعہ ہو۔

اِس رائے کی غلطی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اسکی کوئی دلیل کتاب و سنّت سے نہیں مل سکتی۔ ان حضرات نے انسان کی انفرادی زندگی کو قطعاً نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ شریعتِ اسلامیہ نے انسان کی انفرادی زندگی کو اسی طرح اہمیت دی ہے جس طرح اسکی اجتماعی زندگی کو۔ حکومت و سیاست بھی دین کا ایک شعبہ ہے مگر کل دین یہی نہیں ہے۔ انبیاء و مرسلین کی تعلیمات دیکھیئے۔ کسی نے بھی اس حکم کو ایمانیات میں داخل نہیں کیا ہے۔ کتاب و سنّت نے شرک کے ہر دھبّہ کو موحّدین کے دامن سے مٹانے کی کوشش کی ہے۔ اور توحید خالص کا لباس انھیں عطا فرمایا ہے۔ لیکن لا الٰہ الا اللہ کی تفسیر ان الحکم الا للہ کے ساتھ قرآن و حدیث میں نہیں نہ ملے گی۔

اگر انبیاء سابقین کے حالات پر نظر ڈالئے تو بعض ایسے حضرات ملیں گے جنھوں نے سرے سے اس مسئلہ کو چھیڑا ہی نہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جو چیز رُوحِ دین اور ایمانیات کے ہموزن ہو، اُسے کوئی نبی سرے سے نظر انداز کر جائیں؟۔

اسماء الٰہی دو قسم کے ہیں۔ اوّل وہ ہیں جن کا استعمال غیر اللہ کے لئے کسی طرح بھی جائز نہیں ہے مثلاً اللہ، معبود وغیرہ۔ دوسری قسم میں وہ اسماء داخل ہیں جن کا استعمال مجازاً غیر اللہ کے لئے بھی شرعاً جائز ہے مثلاً رحیم۔ رحیم حقیقی صرف حق تعالیٰ جلّ شانہٗ ہیں۔ جو شخص غیر اللہ کو رحیم حقیقی سمجھتا ہے وہ یقیناً مشرک ہے لیکن مجازاً بندوں کو بھی رحیم کہنا شرعاً جائز ہے۔ بلکہ قرآن آخرت پر

اسکی نظیر موجود ہے۔ حاکم کا لفظ بھی اسی قسم میں داخل ہے۔ بیشک حاکم حقیقی صرف اللہ تعالےٰ جل شانہٗ ہیں۔ جو شخص غیر اللہ کو حاکم حقیقی (یعنی جو محض اپنی ذات کے اعتبار سے حکومت کا مستحق ہو، اور اس کا حکم سب کے احکام سے بالاتر ہو) سمجھے وہ یقیناً مشرک ہے لیکن مجازاً محض ظاہری غیر حقیقی طور پر کسی کو حاکم کہنا شرعاً جائز ہے، بلکہ اس استعمال کے نظائر قرآن و حدیث میں بکثرت موجود ہیں۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے وجود کا یقین رکھتے ہیں اُن میں سے شاید ایک بھی ایسا ہو جو کسی غیر اللہ کو حاکم حقیقی سمجھتا ہو۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ لاحاکم الا اللہ کہے بغیر انسان کا عقیدۂ توحید ناقص کہا جائے؟ جس غلط فہمی میں یہ حضرات مبتلا ہیں وہ درحقیقت مجاز و حقیقت کے درمیان فرق نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ انبیاء و مرسلین کی تعلیمات میں اقامت حکومت کو اوّلین و بنیادی حیثیت حاصل نہیں رہی نہ کسی نبی نے اس مسئلہ کو اپنی کل تعلیمات کا حقیقی محور و مرکز بنایا ہے۔ اُن کے یہاں اوّلین تعلیم عقائد و ایمانیات کی ملتی ہے۔ کل تعلیمات کی رُوح تعلق مع اللہ اور حسن آخرت کی کوشش نظر آتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کی تعلیمات کا ہر شعبہ دوسرے شعبے کا معین و مددگار ہوتا ہے مثلاً شعبہ عبادات، شعبہ اخلاق پر مفید اثر ڈالتا ہے اور اُس کے برعکس اس سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ لیکن اِس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ شعبے خود اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتے ہیں، یا ان سب شعبوں کا اصل مقصود محور کوئی خاص شعبہ ہے۔ یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ عبادات و اخلاق یا دین کی دوسری شاخیں محض اس لئے وجود میں لائی گئی ہیں تاکہ اُن میں سیاست و حکومت کے پھل آئیں۔

اِس مسلک کی تردید میں اتنا ہی لکھنا کافی ہے اِس لئے کہ اِس میں جو دعویٰ کیا گیا ہے اس کا بارِ ثبوت خود حامیان مسلک کے ذمّہ ہے اور متعلق کتاب و سنت سے اس کا کوئی ثبوت نہیں پیش کر سکتے۔

[illegible] شکل میں دوسرا مسلک

پہلے مسلک کا ردِّ عمل ایک دوسرے مسلک کی صورت میں ظاہر ہوا جس میں افراط کا مقابلہ تفریط سے کیا گیا ہے۔ یعنی بعض حضرات نے اس رائے کا اظہار فرمایا ہے کہ حکومت اسلامیہ کا قایم کرنا سرے سے کوئی دینی حکم ہی نہیں ہے۔ اس کے بعد اس کے فرض یا واجب ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اُن کے خیال میں یہ ایک دُنیاوی کام ہے۔ تیسرے اور چوتھے سوال کا جواب ان کے یہاں نفی میں ہے پانچویں تنقیح بھی اس صورت میں ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ جب یہ کوئی دینی حکم ہی نہیں ہے تو مقصود کس طرح ہو سکتا ہے۔ اسکی حیثیت ان حضرات کے نزدیک ایک ذریعہ کی ہے نہ کہ مقصد کی۔ اگر کسی وقت اس مباح کو مستحب کا درجہ بھی حاصل ہو جائے تو بھی یہ غیر مقصود ہی رہے گا۔ بعض حضرات تو اس سے بھی دُور نکل گئے ہیں چنانچہ ایک بزرگ نے جو عالم دین ہونے کے علاوہ سیاسی لیڈری میں ایک مرتبہ یہاں تک فرما دیا کہ اسلام سرے سے اسلامی حکومت کا خواہاں ہی نہیں ہے وہ صرف حکومت عادلہ چاہتا ہے۔

اِس مسلک کی تنقید میں ہم قدرے تفصیل سے کام لیں گے اِس لئے کہ یہ مذکورہ بالا نفسیاتی فضاء سے گہری مناسبت رکھنے کی وجہ سے مسلک اوّل سے زیادہ مضرت رساں ہے۔ مسلک افراط میں تو دین کے ایک شعبہ کی اہمیت کو حدود سے بڑھا دیا گیا ہے، جس کی مضرت سے انکار نہیں مگر اس میں اعتدال پیدا ہو جانا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ لیکن اس مسلک تفریط میں تو دین کے ایک شعبے کو اس سے خارج ہی کر دیا گیا ہے وہ شعبہ بھی ایسا ہے جو عملی زندگی سے تو مدّتیں گذریں کہ مفقود ہو چکا ہے۔ اب اگر وہ علمی اور اعتقادی زندگی سے بھی خارج کر دیا جائے تو اس کھوئی ہوئی چیز کا ملنا قیامت ہی کے دن ممکن ہوگا۔ نفسیاتی اعتبار سے یہ نظریہ مُسلمانوں میں جو پست ہمّتی اور دناءت پیدا کریگا، اس کا نتیجہ بجز دینی و دُنیاوی تباہی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

غلطی کے مناشی

بات بہت صاف ہو جائے گی اگر ہم اس نظریہ کی غلطی واضح کرنے سے پہلے اُن چیزوں پر کچھ روشنی ڈال دیں جن سے یہ پیدا ہوئی ہے۔ ہمارے خیال میں فضاء و ماحول کے اثرات کے علاوہ تین چیزیں اور ہیں،

جن کے اجتماع سے یہ مسلک وجود میں آیا ہے۔ ان امور پر غور کرنے کے بعد صاف طور پر سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ مسلک طبعی طور پر ان سے پیدا ہونا ہی چاہیے تھا۔

تفریق دین و سیاست

نظریہ تفریق دین و سیاست کا زہریلا پودہ تو بہت پرانا ہے لیکن اس کا پورا نشو و نما یورپ کی نئی بیداری کے دور میں ہوا، اور اس وقت سے مغرب اس کے پھل ساری دُنیا کو تقسیم کر رہا ہے۔ مسلمان بھی اس سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہے۔ چنانچہ اسی نظریہ کا زہر خلافت ترکیہ کی موت کا سبب بنا۔

حکومت اسلامیہ کے متعلق مندرجہ بالا تفریطی مسلک رکھنے والے حضرات میں غیر شعوری طور پر اس سے متاثر ہیں۔ اگر اقامتِ حکومت کوئی دینی کام نہیں ہے تو یقیناً سیاست کو دین سے خارج کرنا پڑیگا اور "انتم اعلم بامور دنیاکم" کے بموجب اس بات میں انسان کو اتباعِ شریعت سے آزاد تسلیم کرنا پڑے گا۔

دین کا انفرادی تصوّر

دین کا تعلق صرف انسان کی انفرادی زندگی سے ہے؟ یا اسکی اجتماعی زندگی سے بھی ہے؟ زیر بحث رائے رکھنے والے حضرات غالباً اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ دین کا تعلق محض فرد اور اس کی انفرادی زندگی کے ساتھ ہے۔ سیاست کو دین سے خارج کرنے اور اجتماع کے سب سے بڑے ظرف کو اس کے ہاتھ سے لے لینے کے بعد وہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ اسلام کا حقیقی تعلق صرف انسان کی انفرادی زندگی سے ہے۔

دُنیا کی شرعی حقیقت سے ذہول

یہ عالم جس میں ہم رہتے ہیں "دُنیا" ہے۔ اس کی ہر چیز "دُنیا" کا ایک حصّہ یہاں تک کہ ہم خود اس کا ایک جزو ہیں۔ لیکن دُنیا کی یہ حقیقت عرفی ہے۔ شریعت اسلامیہ کے نزدیک دُنیا کی یہ حقیقت نہیں ہے۔ شرعاً وہ چیز دُنیا ہے جو حق تعالیٰ جل شانہٗ کی یاد سے غافل اور اس سے دُور کرنے والی ہو۔ اس معرفت کی روشنی میں دیکھیے تو دُنیا کوئی ایسی متعین شئے نہیں باقی رہتی ہے جو ہر حالت میں قابل احتراز ہو۔ نماز بھی دُنیا بن سکتی ہے۔ اگر اصولِ دین کے مطابق نہو اور سلطنت بھی دین ہو سکتی ہے بشرطیکہ ان کے مطابق ہو۔

اقامت حکومت کو دُنیا میں شمار کرنا درحقیقت دُنیا عرفی اور دُنیا شرعی میں خلط و التباس کا نتیجہ ہے۔ اگر اقامت حکومت دینی اُصول و احکام کے مطابق اور عین رضاء حق کے لئے ہو تو کیا وجہ ہے کہ اسے "دُنیا" سمجھا جائے؟ اگر دُنیا کی شرعی و دینی حقیقت کو ذہن میں حاضر کر کے اس مسئلہ پر غور کیا جائے تو مسئلہ سہولت کے ساتھ حل ہو سکتا ہے۔

نظریہ کی نوعیت

آگے چل کر میں قرآن مجید اور احادیث نبویہ کی روشنی میں اس نظریہ کی صحت و عدم صحت کے بارے میں تفصیلی بحث کروں گا۔ لیکن اس سے پہلے میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلامیت و غیر اسلامیت کے لحاظ سے اس نظریہ کی نوعیت کیا ہے؟ اور اس کی ساخت اسلامی ہے یا غیر اسلامی؟

ایک مسلمہ مسئلہ ہے کہ اسلام دین فطرت ہے یعنی وہ فطرت انسان کا ترجمان اور اس کے سوالات کا صحیح جواب ہے۔ اس واقعہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ بات بالکل ناممکن معلوم ہوتی ہے کہ اسلام انسان کی انفرادی زندگی کے متعلق تو احکام دے اور بندوں سے کچھ مطالبات کرے لیکن اس قدر اہم اجتماعی مسئلہ کو بالکل نظر انداز کر دے؟ "اکملت لکم دینکم" پر ایمان رکھنے کے بعد یہ بات کس طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ دین کامل کا دامن زندگی کے اس اہم مسئلہ اور فطرت کے اس اہم مطالبہ کے جواب سے بالکل خالی ہے؟

کسی شئے کو مباح کہنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کا کوئی اثر آخرت پر نہیں پڑتا ہے۔ نہ وہ ہمیں جنّت سے قریب کرتی ہے نہ دوزخ سے۔ اقامت حکومت کو اگر ہم مباحات کی صف میں جگہ دیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نظام سیاسی قائم کرنے یا نہ کرنے کا کوئی اثر آخرت پر نہیں پڑے گا۔ اور یہ مسئلہ بھی زندگی کے تکوینی مسائل (مثلاً فن زراعت صنعت وغیرہ) کی طرح حدود شریعت سے خارج ہے۔

حیرت انگشت بدنداں ہو جاتی ہے کہ زندگی کا اس قدر اہم مسئلہ جو اجتماعی فطرت کا بہت ہی شدید مطالبہ اور انسان کی ایک بہت اہم اور ناگزیر ضرورت ہے جس میں غلطیوں کا بھی قوی امکان ہو جاتا ہے اور ان غلطیوں کے نتائج بھی بہت دور رس ہیں اس کا کوئی اثر آخرت پر

نہ پڑے؟ اور وہ دین جو بیع و شریٰ کے انفرادی معاملات و مسائل کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتا ہے اس اہم اجتماعی معاملہ کو نظر انداز کر دے۔ معاملہ بھی ایسا کہ جس پر دین کا اکثر حصّہ موقوف ہے یعنی اسلامی حکومت کے فقدان سے احکام دینیہ کا اکثر و بیشتر حصّہ کلیتًہ یا تقریباً معطل ہو جاتا ہے۔

فرض کیجئے کہ ایک ایسا شہر ہے جس کا ہر باشندہ اعلیٰ درجہ کا متقی صالح اور محتاط ہے ایسی جگہ کسی حکومت کی کیا ضرورت ہے؟ زیر بحث نظریہ رکھنے والے حضرات کی سب سے قوی دلیل یہی ہے۔ اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حکومت کا وجود فی نفسہٖ ضروری نہیں ہے۔ اس لئے شریعت اسے ضروری کیسے قرار دے سکتی ہے؟ اچھا فرض کیجئے کہ ایک شہر کا کوئی باشندہ مالکِ نصاب نہیں ہے اس صورت میں زکوٰۃ کسی پر فرض نہ ہوگی۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ زکوٰۃ شریعت اسلامیہ کے ضروری اور اہم ترین احکام میں سے نہیں ہے؟

یہ جواب تو اُس وقت ہے جب ہم اس مفروضہ اور اس کی بنا پر جو حکم بیان کیا گیا ہے دونوں باتوں کے قائل ہو جائیں۔ حالانکہ اوّل تو یہ مفروضہ ہی عادتًہ بالکل محال و ناممکن ہے۔ افلاطون کے "یوٹوپیا" کی طرح یہ بھی ایک ایسا شہر ہے جس کا وجود قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ شیطان کو قیامت سے پہلے موت نہیں آسکتی۔ دوسرے اگر اسے صحیح بھی سمجھ لیا جائے تو یہ کہنا صحیح نہیں کہ ایسی حالت میں حکومت کا قیام غیر ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں حکومت کو غیر ضروری کہنے کے کیا معنی ہیں؟ شرعًا غیر ضروری یا عقلاً؟ اگر ثانی الذکر مراد ہے تو اس سے کوئی بحث نہیں نہ اس کا کوئی اثر مسئلہ پر پڑتا ہے اس لئے کہ شریعت عقل کے تابع نہیں ہے۔ لیکن اگر اوّل الذکر مراد ہے تو اس کے لئے مستقل دلیل کی ضرورت ہے۔ جب تک یہ نہ ثابت ہو جائے کہ شرعًا قیام امن و امان یا اشاعت تقویٰ ہی اقامت حکومت کی علّت ہے اور اسی پر اس حکم کا دار و مدار ہے اُس وقت تک یہ دعوےٰ کیسے کیا جا سکتا ہے کہ مفروضہ صورت میں اقامت حکومت غیر ضروری ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ چیزیں اس حکم کی حکمتیں ہوں نہ کہ علّت۔ یا ان کا اور بعض دوسری چیزوں کا مجموعہ علّت ہو، یا نفسِ اقامت حکومت کبھی محکم مقصود ہو۔ جب مال کا تائل کرنا بظاہر وجوب زکوٰۃ کی علّت ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر جب مال نہ بھی موجود ہو تو بھی زکوٰۃ فرض ہوگی۔ خیر القرون سے بہتر کون دور ہوگا اور صحابہ کرام کے برابر تقویٰ کس میں ہو سکتا ہے؟ مگر اُس دور میں بھی حکومت قائم کی گئی۔ اس کے بعد کونسا دور اب فرض کیا جا سکتا ہے جس میں قیام حکومت غیر ضروری ہو جائے؟۔

اسلامی احکام پر ایک اجمالی نظر ڈال جائیے۔ اس قسم کے فرضیات پر ان کی بُنیاد ہونا بالکل مزاج شریعت کے خلاف نظر آئے گا۔ اسلام فطرتِ انسانی کو پیش نظر رکھ کر احکام دیتا ہے اور اُن کی بنیاد حقائق و واقعات پر رکھتا ہے نہ کہ منطقی احتمالات و مفروضات پر۔ اِس قسم کے مفروضات پر عمومًا فلسفوں کی عمارتیں تعمیر کی جاتی ہیں جو کبھی اپنی زندگی نہیں بن سکتے۔ چنانچہ انارکزم اور گاندھی ازم اسی قسم کے فروضات و احتمالات کی بُنیاد پر حکومت کو بعض صدر غیر ضروری، بلکہ نامناسب و ناجائز قرار دیتے ہیں۔ زیر بحث نظریہ کی ساخت بھی کچھ ان دونوں "ازموں" سے مشابہت رکھتی ہے۔ اسلام کے مزاج سے تو اسے دُور کا واسطہ بھی نظر نہیں آتا۔

ایک دوسرے نقطۂ نظر سے بھی مسئلہ کی جانچ کیجئے۔ واقعات اور حوادثات ہماری مرضی کے پابند نہیں ہوتے اور نہ عملی دُنیا کا خیالی دُنیا سے کامل مطابقت رکھنا ضروری ہے، بلکہ عمومًا ان دونوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اگر کسی مقام پر باوجود استطاعت مسلمان اسلامی حکومت قائم نہ کریں تو یہ بات یقینی ہے کہ وہ کسی غیر اسلامی حکومت کی ماتحتی پر مجبور ہو جائیں۔ اِس لئے کہ "انارکی" اور "فرضیت" بالکل خلاف فطرت ہے۔ اور ایسے موقعہ کو کوئی شیطانی طاقت ہاتھ سے کھونے کے لئے تیار نہیں ہو سکتی۔ قطع نظر اس سے کہ اسلام نے اس کا کوئی حکم دیا ہے یا نہیں؟ یہ چیز غیرت ایمان کے کس قدر منافی ہے کہ اللہ کا دوست اللہ کے دشمنوں کی محکومی کو خوشی خوشی گوارا کر لے اور اپنے ہاتھوں سے غیروں کا طوقِ غلامی اپنی گردن میں پہن لے؟ شاید دُنیا کا کوئی مذہب بھی اپنے پیرؤوں کے لئے غیروں کی محکومی کو روا نہ رکھتا ہو۔ پھر اسلام جو دین فطرت اور اللہ کا دین ہے کس طرح انسان کی فطری غیرت اور اپنے نام لیواؤں کے شرف و اعزاز کو

نظر انداز کر سکتا ہے؟ وہ کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ سلطانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام غیروں کا جُوا اپنی گردن پر رکھیں؟ اُسے کس طرح برداشت ہو سکتا ہے کہ اللہ واحد کا پرستار غیر اللہ کے پرستاروں کا محکوم ہو؟۔

پہلا مسئلہ یہ مسئلہ کا ایک افقی جائزہ اور اس پر اجمالی تنقید تھی۔ آئندہ سطروں میں ہم ایک ایک سوال پر علیحدہ علیحدہ تفصیلی بحث کرینگے اور نقل و عقل کی روشنی میں اس کی جانچ کریں گے۔ یاددہانی کے لئے ہم انھیں مکرر ذکر کرتے ہیں:۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اقامتِ حکومت اسلامیہ کوئی شرعی حکم ہے یا نہیں؟ بعض حضرات کا جواب یہ ہے کہ یہ کوئی شرعی اور دینی حکم نہیں ہے۔ نہ دین سے اسے کوئی واسطہ ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ احکام صلوٰۃ و صوم کی طرح یہ بھی ایک دینی حکم ہے۔ اور سیاسیات دوسرے معاملات کی طرح دین کا ایک بہت بڑا شعبہ ہے۔ اس دعوے سے اختلاف رکھنے والے حضرات کے دلائل درج ذیل ہیں:۔

(۱) دین وہ ہے جو کُل انبیاء میں مشترک رہا ہے، اور حکومت و سلطنت بہت سے انبیاء کو نہیں دی گئی اور نہ ادیان سابقہ میں سے ہر ایک میں سیاسی احکام ملتے ہیں اس لئے زندگی کا یہ شعبہ دین سے خارج ہے۔

(۲) انبیاء میں سے کسی نے بھی (جہاں تک علم ہے) اقامتِ حکومت کی دعوت نہیں دی ہے۔ اگر یہ دین کا کوئی شعبہ ہوتا تو انبیاء میں سے کم از کم بعض نے اس کی دعوت دی ہوتی۔

(۳) کوئی نص قرآن مجید میں ایسی نہیں ہے جس میں اقامتِ حکومت کا حکم دیا گیا ہو۔

(۴) دین وہ ہے جس پر حق تعالےٰ کا قُرب اور اُس کی رضامندی کا حصول موقوف ہو۔ اقامتِ حکومت میں یہ علامت مفقود ہے۔ انسان صوم و صلوٰۃ، ذکر و فکر کے ذریعہ سے ہر حالت میں ان مقاصد کو حاصل کر سکتا ہے، حکومت اسلامیہ ہونے نہ ہونے کا اُس پر کوئی بھی اثر نہیں ہوتا۔

(۵) دینی احکام ہر حالت میں باقی رہتے ہیں مثلاً نماز ہر حالت میں ضروری ہے، لیکن اقامتِ حکومت ہر حالت میں کسی کے نزدیک بھی ضروری نہیں ہے اس لئے یہ دین کا کوئی شعبہ نہیں ہو سکتا۔

تنقید آئیے، عقل و نقل کی روشنی میں ان دلائل کی جانچ کریں۔ ابتداء پہلی ہی دلیل سے کیجئے:۔

یہ دعویٰ کہ "دین وہ ہے جو کل انبیاء میں مشترک رہا ہے" خود محتاجِ دلیل ہے۔ دین کی یہ خاصیت کہاں بیان کی گئی ہے؟ قرآن مجید میں؟ یا حدیث میں؟ اگر ان دونوں میں یہ بات نہیں ملتی ہے اور یقیناً نہیں ملتی ہے تو اسے تسلیم کرنے پر ہم مجبور نہیں ہیں۔

اس دعوے کی غلطی کے لئے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ یہ بے دلیل ہے۔ لیکن اظہار استدلال کے لئے نہیں بلکہ اظہار واقعہ کے لئے یہ عرض کر دینا دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ اس کے خلاف بھی دلائل قائم ہیں۔ بیشک دین کی بُنیادی باتیں کُل انبیاء کے درمیان مشترک رہی ہیں۔ لیکن پُورے دین میں یہ صفت اشتراک نہیں پائی جاتی۔ عقائد و ایمانیات میں اجمالی حیثیت سے توحید، رسالت اور معاد کے عقائد کُل انبیاء کی تعلیمات میں مشترک طور سے پائے جاتے ہیں لیکن تفصیلات مشترک نہیں ہیں یعنی عقائد بعض انبیاء کے یہاں مجمل ہیں اور دوسروں نے انھیں ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہانتک کہ اُن کی مفصّل ترین شکل اسلام محمّدی صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں ملتی ہے۔ مثلاً عقیدہ آخرت کل انبیاء کی تعلیمات میں مشترک ہے، لیکن اس کی جسقدر تفصیل دین محمّدی صلی اللہ علیہ وسلم میں ملتی ہے اتنی کسی دین میں بھی نہیں ملتی۔ کیا یہ غیر مشترک تفصیلات دین میں داخل نہیں ہیں؟ کیا جنّت پر ایمان مجمل کے ساتھ اس کی تفصیلات اگر سامنے آئیں تو اُن پر بھی ایمان لانا فرض نہیں ہے؟ اگر کوئی شخص جنّت کی حُوروں یا تسنیم و سلسبیل یا لباس حریر کا انکار کرے تو کیا وہ کافر نہ ہو جائے گا؟

عقائد کے بعد اعمال کا درجہ آتا ہے، اس بارے میں تو

مختلف انبیاء کی تعلیمات میں اچھا خاصا فرق ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیٰ نبیّنا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے یہاں جہاد کی تعلیم سرے سے ملتی ہی نہیں ہے۔ اسی طرح خود حضرت آدم علیٰ نبیّنا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے یہاں بھی یہ حکم مفقود معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ اُس دور میں اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ حضرت نوح علیٰ نبیّنا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے تذکرے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ساڑھے نو سو برس کی زندگی میں کبھی اس فریضہ کی ترغیب نہیں دی۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیٰ نبیّنا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے حج کا کچھ پتہ نہیں لگتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جہاد و حج دین میں شامل نہیں ہیں؟ پھر سیاست بھی کیا خصوصیت ہے جس کی وجہ سے وہ محض کل انبیاء کی تعلیمات میں جزو مشترک نہ ہونے کی بناء پر دین سے خارج کر دی جائے؟ حالانکہ حدیث سے ثابت ہے کہ یہ شعبہ دین انبیاء بنی اسرائیل کے یہاں تو مشترک رہا ہے:۔

کانت بنو اسرائیل تسوسهم الانبیاء وکلما هلك نبی خلفه نبی و انه لانبی بعدی وسیکون خلفاء فیکثرون قالوا فما تأمرنا قال فوا ببیعة الاول فالاول واعطوهم حقهم فان الله سائلهم عن استرعاهم۔

"بنو اسرائیل کی سیاست انبیاء کے ہاتھ میں ہوتی تھی جب ایک نبی کا انتقال ہو جاتا تھا تو دوسرے نبی اس کے جانشین ہو جاتے تھے۔ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا بلکہ بکثرت خلفاء ہوں گے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ حضور! ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا کہ جو پہلا ہو اُس کی بیعت پر قائم رہو اور اپنا حق ادا کرتے رہو، اللہ تعالیٰ اُن سے اُن کی رعیت کے بارے میں خود محاسبہ فرمائیں گے۔"

دوسری دلیل دوسری دلیل تو پہلی سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ انبیاء کرام کے دو کام رہے ہیں۔ اوّل کفار کو ایمان کی دعوت دینا۔ دوم خود اہل ایمان کی اصلاح و تربیت۔ پہلی صورت میں انبیاء کا طرز یہ رہا ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے بنیادی عقائد کی دعوت، فطری طور پر اُن کی دعوت کا طرز یہی ہونا چاہئے تھا اس لئے کہ کُل اعمال و اخلاق کی بنیاد ایمان پر قائم ہے اور دین کی ابتداء اسی

ہوتی ہے۔ اِس کے کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ عقائد و ایمانیات کو چھوڑ کر اس کے فروع کی دعوت دینا شروع کر دیتے۔ مگر اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ انھوں نے جن اُمور کی دعوت کفار کو نہیں دی وہ دین سے خارج ہیں؟ نماز، روزے کی دعوت بھی کفار کو نہیں دی گئی ہے، تو کیا نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ اعمال دین سے خارج ہیں؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکومت سیاست کا وہ درجہ نہیں ہے جو عقائد و ایمانیات کا ہے۔ لیکن اس کا انکار کس کو ہے۔ جو شخص حکومت و سیاست کو ایمان کے درجہ پر رکھے وہ یقیناً سخت غلطی میں مبتلا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو شخص نماز روزہ کو بھی ایمانیات کے درجہ پر لے آئے وہ بھی غلط روی میں اس سے پیچھے نہیں ہے۔

ایسی صورت میں یہ مسئلہ تو سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا کہ انبیاء نے کافروں کو حکومت و سلطنت قائم کرنے کی دعوت کیوں نہیں دی۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ انھوں نے اہلِ ایمان کو اس کی دعوت دی یا نہیں؟

فرض کیجئے کہ کسی نبی نے بھی اہلِ ایمان کو اس کی دعوت نہیں دی ہے، تو کیا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اقامتِ حکومت کا عمل دین سے خارج ہے؟ بیشک یہ بات لازم آسکتی تھی بشرطیکہ کسی نبی نے دعوت نہ دینے کے ساتھ ساتھ عملاً بھی کوئی حکومت نہ قائم کی ہوتی اور حکمرانی کے لوازم مثلاً اجراء حدود و قصاص وغیرہ سے وہ بالکل بے تعلق رہتے۔ نیز حکومت و سیاست کے متعلق اُصول احکام کی کوئی تعلیم نہ دی ہوتی۔ لیکن ان سب اُمور کے عملی ظہور کے بعد محض قولی دعوت نہ ہونے سے تو ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ زندگی کا یہ اہم شعبہ دین سے خارج ہو۔ ایک دو نہیں معلوم نہیں کتنے انبیاء کو تاجِ نبوۃ کے ساتھ ساتھ تختِ سلطنت بھی عطا فرمایا گیا تھا اور اُنھوں نے ساری عُمر اس کام کو انجام دیا۔ خود خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کی مکّی زندگی کو چھوڑ کر پوری حیات مبارکہ سلطنت و حکومت کے ساتھ بسر ہوئی۔ کیا انبیاء کرام سے اس کی توقع رکھی جا سکتی ہے کہ انھوں نے ایک غیر دینی مشغلہ میں اپنی مبارک عمروں کا بیشتر حصہ ضائع کیا؟ قرآن مجید اور احادیث نبویہ کو دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ انبیاء کی

ایک بڑی تعداد کو سلطنت و حکومت عطا کی گئی تھی۔

ام یحسدون الناس علی ما اٰتٰھم اللہ من فضلہ فقد اٰتینا اٰل ابراھیم الکتٰب والحکمۃ و اٰتینٰھم ملکا عظیما (النساء پ۵)

"یا دوسرے لوگوں سے اس چیز پر جلتے ہیں جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی ہے تو ہم نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے خاندان کو کتاب بھی دی اور حکمت بھی اور انھیں بہت بڑی سلطنت بھی عطا فرمائی ہے۔"

حدیث میں ہے:-

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفہ نبی وانہ لا نبی بعدی وسیکون خلفاء فیکثرون قالوا فما تأمرنا قال فوا ببیعۃ الاول فالاول واعطوھم حقھم فان اللہ سائلھم عما استرعاھم

"بنو اسرائیل کی سیاست انبیاء کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ جب ایک نبی کا انتقال ہو جاتا تو دوسرے نبی ان کے جانشین ہو جاتے تھے۔ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ بلکہ بکثرت خلفاء ہوں گے صحابہ نے عرض کیا کہ حضور ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا کہ جو پہلا ہو اس کی بیعت پر قائم رہو اور ان کا حق ادا کرتے رہو اللہ تعالیٰ ان سے ان کی رعیت کے بارے میں خود محاسبہ فرمائیں گے"

حضرات داؤد، سلیمان، یوسف، موسیٰ علیہم السلام اور خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء گرامی تو اس سلسلہ میں بہت مشہور ہیں۔

یہ سب تو اس مفروضہ کی بناء پر ہے کہ انبیاء کرام نے اقامت حکومت کی دعوت نہیں دی ہے۔ لیکن یہ مفروضہ ہی سرے سے خلاف واقعہ ہے۔ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ انبیاء کرام نے اپنے متبعین کو اس کی دعوت دی ہے۔ ثبوت کے لئے آئندہ سطریں ملاحظہ فرمائیے:-

واذ قال موسیٰ لقومہ یٰقوم اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا واٰتٰکم ما لم یؤت احدا من العٰلمین۔ یٰقوم ادخلوا الارض المقدسۃ التی کتب اللہ لکم ولا ترتدوا علی ادبارکم فتنقلبوا خٰسرین ۔ قالوا یٰموسیٰ ان فیھا قوما جبارین وانا لن ندخلھا حتی یخرجوا منھا فان یخرجوا منھا فانا داخلون قال رجلٰن من الذین یخافون انعم اللہ علیھما ادخلوا علیھم الباب فاذا دخلتموہ فانکم غٰلبون وعلی اللہ فتوکلوا ان کنتم مؤمنین (مائدہ پ۶)

"اور جب حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم اللہ تعالیٰ کے انعامات جو تم پر ہوئے ہیں یاد کرو جبکہ اللہ تعالیٰ نے تم میں بہت سے پیغمبر بنائے اور تم کو صاحب ملک (سلطنت) بنایا۔ اور تمہیں وہ چیزیں دیں جو دنیا جہان والوں میں سے کسی کو نہیں دیں۔ اے میری قوم اس متبرک سرزمین میں داخل ہو جسے اللہ تعالیٰ نے تمہارا حصہ میں لکھ دیا ہے اور پیچھے نہ پلٹو ورنہ خسارے میں پڑ جاؤ گے۔"

"کہنے لگے اے موسیٰ وہاں تو بڑے بڑے زبردست آدمی ہیں۔ اس لئے ہم تو وہاں اسوقت تک ہرگز قدم نہ رکھیں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ ہاں اگر وہ وہاں سے کہیں اور چلے جائیں تو ہم بے شک جانے کو تیار ہیں۔ ان دو شخصوں نے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے تھے اور جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل کیا تھا کہا کہ تم ان کے مقابلہ میں دروازے تک تو چلو۔ تم جس وقت دروازے میں قدم رکھو گے اسی وقت غالب آجاؤ گے اور اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ ہی پر اپنی نظر رکھو۔"

اس موقعہ پر حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی قوم کو کس چیز کی دعوت دے رہے ہیں؟ کیا یہ دعوت سلطنت و حکومت قائم کرنے کی نہیں ہے؟ اور دعوت بھی اس شاندار تمہید کے ساتھ کہ نعمت سلطنت کا تذکرہ انعام نبوت کے پہلو بہ پہلو کیا گیا ہے پھر اس دعوت کو رد کر دینے کے نتیجہ کو "خسارہ" قرار دیا گیا ہے۔ اور اس عمل صالح کے لئے جان کی بازی لگانے اور خون بہانے کا حکم دیا گیا ہے۔

بنو اسرائیل نے اقامت حکومت کی اس دعوت کو رد کر دیا اس کے نتیجہ میں حق تعالیٰ کے غضب و عذاب میں مبتلا ہوئے۔ قرآن مجید ہی کا بیان ہے:-

قال فانہا محرمۃ علیہم اربعین سنۃً یتیہون فی الارض فلا تأس علی القوم الفاسقین ط (مائدہ پ ۶)

"ارشاد ہوا کہ یہ مُلک ان کے ہاتھ چالیس برس تک نہ آئے گا یوں ہی زمین میں سرمارتے پھریں گے۔ پس آپ اس قوم فاسق پر رنج نہ کیجیے۔"

کیا یہ بنو اسرائیل نماز نہ پڑھتے تھے؟ یا روزے نہ رکھتے تھے؟ یا نبی علیہ السلام کی موجودگی میں ان کے اندر فسق و فجور عام ہو سکتا تھا؟۔ صاف بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ غضب و عذاب اور فاسق کا یہ لقب محض اسی نافرمانی کا نتیجہ تھا جس کا ارتکاب انھوں نے اقامتِ حکومت کے بارے میں کیا تھا۔ اس کی سزا سے نہ اُن کی نمازیں روک سکیں نہ روزے نہ صدقات و خیرات۔ کیا کسی دُنیاوی کام پر بھی انبیاء اس قدر زور دیتے ہیں؟ اور کیا کسی دُنیاوی کام پر بھی اس طرح سے عذاب و غضب کا نازل کرنا سنۃ اللہ ہے؟۔

آیاتِ ذیل بھی اس سلسلہ میں ملاحظہ ہوں:۔

الم تر الی الملأ من بنی اسرائیل من بعد موسیٰ اذ قالوا لنبیٍّ لہم ابعث لنا ملکاً نقاتل فی سبیل اللہ قال ہل عسیتم ان کتب علیکم القتال الا تقاتلوا قالوا وما لنا ان لا نقاتل فی سبیل اللہ وقد اخرجنا من دیارنا وابنائنا۔ (البقرہ)

"حضرت موسیٰ کے بعد بنو اسرائیل کے ایک گروہ کا حال آپ کو معلوم ہے؟ جب انھوں نے اپنے نبی سے درخواست کی کہ ہمارا ایک بادشاہ مقرر کر دیجیے تاکہ ہم (اسکی سرکردگی میں) اللہ کے راستے میں قتال کریں۔ اُنھوں نے فرمایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب تم پر جنگ کرنا فرض کیا جائے تو جنگ نہ کرو۔ انھوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ ہمیں اپنے وطن اور اپنی اولاد سے چھڑا دیا گیا۔"

بنو اسرائیل اقامتِ سلطنت کی درخواست کرتے ہیں اس زمانہ کے نبی اس درخواست پر یہ نہیں فرماتے کہ تم غیر مقصود کی درخواست کیوں کرتے ہو۔ یا سلطنت کو ایمان و عمل صالح پر موعود ہے وہ خود بخود حاصل ہو جائے گی۔ بلکہ ان کی درخواست کو صحیح سمجھتے ہوئے اُن میں سلطنت کی قابلیت پیدا کرنے کے لئے مربیانہ انداز میں اُن کے جذبۂ ثبات و وفاداری کو اُبھارتے ہیں۔ اور اُن سے اس کا وعدہ لیتے ہیں۔ عہد و پیمان ہونے پر بحکمِ الٰہی ملک کا انتخاب فرما کر اقامتِ حکومت کی دعوت اِن الفاظ میں دیتے ہیں:۔

وقال لہم نبیہم ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکاً۔

"اور ان کے نبی نے اُن سے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ بنایا ہے۔"

پھر جب قوم طالوت کی حکومت قبول کرنے میں پس و پیش کرتی ہے تو وہ نبی علیہ السلام ان کے شکوک دُور کرتے ہیں اور دلائل کے ذریعہ سے طالوت کے استحقاقِ حکومت کو واضح کر کے اقامتِ حکومت کی دعوت بہت پُرزور طریقے سے دیتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

پاکستانی خریداروں کو ضروری اطلاع

"ندائے حرم" کے ذریعہ رسالہ "دارالعلوم" کی رقوم کے تبادلہ کا جو انتظام تھا بعض وجوہ سے وہ سردست ٹوٹ گیا ہے، اس لئے خریدارانِ پاکستان سے گذارش ہے کہ وہ اجراء رسالہ کی اطلاع دفتر رسالہ "دارالعلوم" کو دیں مگر اپنا چندہ تا اطلاع ثانی اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ (ناظم رسالہ)

بقیہ "فلسفۂ نعمت و مصیبت"

اور عذابات پیدا ہونے کی کیفیت یکساں نہیں ہے۔ بلکہ انسانی عیوب یعنی طبعی اور عقلی بے اعتدالیوں سے آفاقی مصیبتیں نمایاں ہونے میں اور علاقہ کام کرتا ہے اور ذنوب یعنی شرعی بے اعتدالیوں سے جہان میں عذابات نمایاں ہونے میں دوسرا علاقہ کام کرتا ہے۔ دونوں رابطوں کی صورت بھی جُدا جُدا ہے اور اُن رابطوں سے مصائب نمایاں ہونے کی کیفیت بھی الگ الگ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ طبعی و عقلی جرائم سے مصائب کے نمایاں ہونے میں درمیانی رشتہ وجود طبعی ہے اور شرعی جرائم سے عذاباتِ خداوندی ظاہر ہونے میں درمیانی رشتہ علم و ادراک ہے۔ (باقی)

پہلی قسط:-

عہدِ نبوی میں قرآن مجید کی تدوین و ترتیب

(مولانا محمد بدر الدین صاحب علوی مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ)

"مولانا موصوف کا یہ مقالہ ملک کے مشہور علمی مجلہ "معارف" اعظم گڑھ میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ لیکن مولانا نے خاص طور پر اسے "دار العلوم" میں بھی اشاعت کے لئے بھیجا اور اسے ہم نے قبول کیا۔
جمع و ترتیب قرآن اور اس کی تدریجی صورتوں کے متعلق مولانا نے اس مقالہ میں جو تحقیق پیش فرمائی ہے۔ ہم مضمون کے اخیر میں انشاء اللہ ان کے متعلق اپنی رائے ظاہر کریں گے۔ اور اگر ہمارے مضمون نگار حضرات اس موضوع پر کچھ اور تحریر فرمانا چاہیں تو رسالہ "دار العلوم" مسرت کے ساتھ اُن کے خیالات کی اشاعت کے لئے بھی گنجائش پیدا کرے گا" (مدیر)

قرآن مجید کا پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونا اور اس کی ہدایت اور اس کے احکام کا بغیر حذف و کمی اور بغیر تغیر و تبدل ہمیشہ قائم رہنا لازمی طور پر اس کا مقتضی تھا کہ وہ خود عہد نبوت میں ہی مرتب ہو کر کتابی صورت میں آجائے تاکہ اصلی معنوں میں محفوظ ہو جائے اور حذف و ترمیم اور تغیر و تبدل کا شبہ ہی مٹ جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ مرتب ہو کر بصورت کتاب نبی کریم کے زمانے میں تیار ہو گیا تھا اور کتابت میں مکمل موجود تھا، جس کی ترتیب وہی تھی جو آج ہے۔ مندرجہ ذیل واقعات اس امر کے لئے ناقابل تردید دلائل ہیں:۔

۱۔ قرآن مجید خود اپنے آپ کو بے شمار مقامات پر مکی سورتوں میں بھی کتاب کے نام سے یاد کرتا ہے:۔ مثلاً

(۱) كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ۔ (مکی) "یعنی یہ وہ کتاب ہے کہ جس کی آیتیں واضح کر دی گئی ہیں۔"

(۲) الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَىٰ عَبْدِهِ الْكِتَابَ (مکی) "یعنی سب تعریفیں خدا ہی کے لئے ہیں جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی۔"

(۳) ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ (مدنی) "یعنی یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی بھی شبہ نہیں ہے۔"

(۴) يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (مدنی) "یعنی پیغمبر لوگوں کو کتاب و حکمت سکھلاتے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔

لفظ کتاب کا استعمال مکی سورتوں میں اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ قرآن مجید نے آغاز ہی میں کتابی صورت حاصل کر لی تھی۔

۲۔ قرآن مجید نے جہاں اپنے خلاف کفار کے اعتراضات کو بیان فرمایا ہے اُن میں ایک اعتراض یہ بھی ہے:۔

قَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا۔ "یعنی کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن پچھلے لوگوں کی کہانیوں کا مجموعہ ہے جس کو پیغمبر نے لکھا دیا ہے۔"

یہ اعتراض بزمانہ نزول صرف اُسی وقت درست ہو سکتا ہے جبکہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ ترتیب پا کر لکھا جاتا تھا۔

خود قرآن مجید سے اجمالی طور پر یہ امر ثابت ہو جانے کے بعد احادیث اور سیر سے ثابت شدہ مندرجہ ذیل امور بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ واقعۃً قرآن مجید کی تحریر و ترتیب عہد نبوی میں شروع ہو گئی تھی اور وہ اسی زمانہ میں مرتب ہو گیا تھا۔

۳۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ میں سے بہت سے

لوگوں کو کتابت وحی کے کام پر مقرر فرما دیا تھا۔ اس قسم کے اڑتیس ۳۸ صحابیوں کی فہرست محدّث ابن سید الناس (المتوفی ۷۳۴ھ) نے اپنی کتاب مسمّیٰ "عیون الاثر" جلد ۲ صہ ۳۱۵ و صہ ۳۱۶ پر دی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ قرآن لکھا کرتے تھے۔

ایک اور سیرت کی کتاب جس کا نام "السیرۃ الحلبیہ" ہے، اس کی جلد دوم صہ ۴۲۶ پر بیس ۲۰ کاتبین وحی کے نام درج ہیں، ان ناموں کو مصنّف نے بروایتے چھبیس ۲۶ و بروایتے بیالیس ۴۲ کاتبین کے ناموں سے انتخاب کیا ہے۔ ان فہرستوں میں خلفاء اربعہ رضؓ حضرت معاویہ اور دوسرے صحابہ جو تحریر کا کام جانتے تھے مثلاً:۔ عبداللہ بن مسعود اور زید بن ثابتؓ وغیرہما شامل ہیں۔ حضرت معاویہ کا کاتبینِ وحی میں ہونا مجمع الزوائد جلد اول صہ ۶۰ و صہ ۶۱ اور صحیح مسلم مصری جلد دوم صہ ۲۶۴ سے بھی ثابت ہے۔ جہاں یہ مذکور ہے کہ ان کے والد ابو سفیان نے رسول اللہ سے درخواست کی تھی کہ ان سے کتابت کا کام لیا جائے۔ چنانچہ حضورؐ نے اس کو منظور فرما لیا۔

۴۔ جب کوئی وحی نازل ہوتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کاتبین وحی کو منفرداً یا مجتمعاً جیسی صورت ہوتی طلب فرماتے۔ اور خود بول کر ان کو وحی لکھوا دیتے۔ ان واقعات کا ثبوت ملاحظہ ہو (الف) ترمذی مطبوعہ دہلی، جلد دوم صفحہ ۱۳۴ :۔

قال عثمان کان اذا نزل علیہ الشیٔ دعا بعض من یکتب۔ (ترمذی صہ ۱۳۴)

"یعنی جب وحی نازل ہوتی تو رسول اللہ کاتبوں میں سے کسی کو لکھنے کے لئے بلاتے۔"

(ب) صحیح بخاری مصری جلد سوم صہ ۷۶ :۔

عن البراء لما نزل لایستوی القاعدون الخ دعا رسول اللہ زیداً فکتبہا۔ (صحیح بخاری مصری صہ ۷۶ ج ۳)

"یعنی حضرت براء کہتے ہیں کہ جب آیت لایستوی القاعدون الخ نازل ہوئی تو آنحضرتؐ نے زید کو بلایا اور انہوں نے اس آیت کو لکھ لیا۔"

(ج) عن زید بن ثابتؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم املٰی علیہ لایستوی القاعدون الخ (صحیح بخاری صہ ۷۶)

"یعنی خود زید بن ثابت کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے آیت لایستوی القاعدون الخ مجھے بول کر لکھائی۔"

(د) عن عبد اللہ بن عمرؓ اذ نحن عند رسول اللہ نکتب الخ (سنن دارمی صہ ۶۸)

"یعنی عبداللہ بن عمرو (جو کہ کاتبین وحی سے ہیں) فرماتے ہیں کہ دراں حالیکہ ہم لوگ (جماعت کاتبین) رسول اللہ کے گرد کتابت میں مصروف تھے۔"

۵۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید لکھوانے کے بعد فرماتے تھے کہ لکھا ہوا آپ کو پڑھ کر سنایا جائے تاکہ اگر کوئی غلطی ہو گئی ہو تو اس کو درست کرا دیں۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت سے روایت ہے:۔

فاذا فرغت قال اقراءہ فاقراہ فان کان فیہ سقط اقامہ۔ (مجمع الزوائد ج ۱ صہ ۶۰)

"یعنی جب میں لکھ چکتا تو حضرتؐ فرماتے کہ پڑھو، میں پڑھتا اگر اس میں کوئی غلطی ہوتی تو آپؐ اس کو درست فرما دیتے۔"

۶۔ جس وقت آنحضرتؐ کاتبینِ وحی کو قرآن مجید لکھواتے تو یہ بھی ہدایت فرماتے کہ آپ کی بتائی ہوئی ترتیب پر لکھیں (الف) ترتیب آیات کے متعلق یہ ارشاد نہایت صفائی کے ساتھ احادیث میں مذکور ہے۔ ترمذی جلد دوم مطبوعہ دہلی صہ ۱۳۴ پر ہے :۔

فیقول ضعوا ہذہ الآیات فی السورۃ التی یذکر فیہا کذا وکذا۔ (ترمذی ج ۲ صہ ۱۳۴)

"یعنی ان آیتوں کو اس سورۃ میں لکھو جس میں فلاں فلاں باتیں بیان کی گئی ہیں۔"

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر سورت جدا جدا لکھی جاتی تھی (ب) مندرجہ ذیل حدیث اس پر دلیل ہے کہ سورتوں کی ترتیب، عہدِ نبویؐ میں ہو چکی تھی۔ سنن ابی داؤد (مطبوعہ نولکشور ۱۸۷۷ء) جلد اول صہ ۱۲۸ پر ہے :۔

عن حذیفۃ انہ رأی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اللیل ـــــ فصلی اربع رکعات فقرء فیہن البقرۃ وآل عمران والنساء والمائدۃ والانعام (ملخصاً)

"یعنی حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے آنحضرتؐ کو رات میں چار رکعت نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور آپؐ نے ان میں سورۂ بقر، آل عمران، نساء، مائدہ اور انعام پڑھیں۔" (سنن ابی داؤد جلد اول صہ ۱۲۸)

اس حدیث میں ان سورِ قرآنی کی ترتیب وہی ہے جو اس وقت

ہمارے ہاتھوں والے قرآن مجید میں ہے اور جب ان سورتوں کی ترتیب ثابت ہو گئی تو بقیہ کی ترتیب بھی یقیناً عہدِ نبویؐ کی ہے۔ علاوہ بریں عہدِ نبویؐ میں قرآن مجید اور اس کی سُورتوں کے مرتّب ہو جانے کی شہادت مندرجہ ذیل احادیث سے بھی ملتی ہے۔

(۱) ترمذی جلد دوم ص ۱۱۸ و ص ۱۱۹ میں ہے:۔

عن ابن عباسؓ قال قال رجل یارسول اللہ ای العمل احب الی اللہ قال الحال المرتحل۔

"یعنی آنحضرتؐ سے ایک شخص نے پوچھا کہ کونسا عمل اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے؟ آپ نے فرمایا سفر سے اُترنا اور سفر کرنا"

(ترمذی ج ۲ ص ۱۱۸ و ص ۱۱۹)

یہ حدیث اتنی ہی ہے۔ لیکن دارمی ص ۴۴۲ پر یہ بھی ہے:۔

قیل ما الحال المرتحل قال صاحب القرآن یقرء عن اول القرآن الی اٰخرہ و من اٰخرہ الی اوّلہ کلما حلّ ارتحل۔

"یعنی پوچھا گیا کہ سفر سے اُترنا اور پھر سفر کرنے کا کیا مطلب ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ قرآن پڑھنے والا جو اوّل سے آخر تک تلاوت کرتا ہے اور ختم کر لیتا ہے پھر دوبارہ شروع کر دیتا ہے گویا جیسے ہی تلاوت کا سفر ختم کرتا ہے ویسے ہی دوسرا سفر تلاوت کا شروع کر دیتا ہے"

(دارمی ص ۴۴۲)

اس حدیث میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ شروع اور ختم جب ہی ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید اپنی سُورتوں کے ساتھ مرتب ہو۔

(۲) اسی طرح صحابہؓ کے دریافت کرنے پر کہ قرآن مجید کتنے دنوں میں ختم کرنا چاہئے آنحضرتؐ نے مختلف تحدیدیں بیان فرمائی ہیں جو پانچ دن سے لے کر چالیس دن تک ہیں۔ ترمذی جلد دوم ص ۱۱۸ پر ہے،۔

عن عبد اللہ بن عمرو قال قلت یارسول اللہ فی کم اقرأ القراٰن قال اختمہ فی شہر قلت انی اطیق افضل من ذلک قال اختمہ فی عشرین قلت انی اطیق افضل من ذلک قال اختمہ فی خمس قلت انی اطیق افضل من ذلک فما رخص لی۔

"یعنی عبد اللہ بن عمرو فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! میں کتنے دنوں میں قرآن ختم کروں؟ آپ نے فرمایا تیس دن میں، میں نے عرض کیا میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ فرمایا کہ بیس دن میں (بالآخر) فرمایا کہ پانچ دن میں ختم کرو۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ مگر آپؐ نے اور کمی کی اجازت نہیں دی"

(ترمذی ج ۲ ص ۱۱۸)

ایک اور روایت انہیں عبد اللہ بن عمرو سے ترمذی کے اسی صفحہ پر مروی ہے:۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لہ اقرأ القراٰن فی اربعین۔

"یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو چالیس دن میں قرآن ختم کرنے کی ہدایت فرمائی"

یہ تمام حدیثیں بھی جو ختم قرآن کے متعلق ہیں اس عہد میں قرآن مجید کے مرتّب ہونے پر دلالت کرتی ہیں کیوں کہ بغیر ترتیب نہ ابتداء ہو سکتی ہے نہ اختتام۔

۷۔ غرض اس طریقہ پر کاتبینِ وحی کے لکھے ہوئے متعدد نسخے قرآن مجید کے عہدِ نبویؐ میں وجود میں آچکے تھے جن میں اسوقت تک کی نازل شدہ آیات سُورتیں مرتّب تھیں اور آگے اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ چار صحابہؓ کے مرتّب کئے ہوئے چار نسخوں کا ثبوت صحیح بخاری مصری جلد سوم ص ۱۸۶ اور صحیح مسلم مصری جلد دوم ص ۲۵۲ سے ملتا ہے۔ یہ نسخے حضرت معاذ بن جبل، ابی بن کعب، زید بن ثابت اور ابو زید کے تھے۔ اس عہد کے ان چار مرتب نسخوں پر دو نسخوں کا اضافہ اور ثابت ہے، ایک تہذیب التہذیب جلد ہفتم ص ۲۴۳ کی سند سے جو حضرت عقبہؓ بن عامر الجہنی کا تھا اور دوسرا حضرت سعد بن عبید کا، جس کا ذکر استیعاب جلد دوم ص ۵۶۵ پر ہے۔

ان اقتباسات کی بُنیاد پر چھ نسخوں کا وجود عہدِ نبویؐ میں ثابت ہے۔ طبقات ابن سعد جلد دوم ص ۱۱۲ پر زیر عنوان "اُن لوگوں کا ذکر جنہوں نے رسول اللہ کے عہد میں قرآن مجید جمع کر لیا تھا" مکررات کو چھوڑ کر تین روایتوں میں دس صحابہ کے نام گنائے ہیں۔ اس فہرست میں چار تو وہی ہیں جو اوپر صحیح بخاری و صحیح مسلم کے حوالہ سے بیان ہوئے پانچواں نام وہ ہے جس کو استیعاب کے حوالہ سے بیان کیا جا چکا۔ اس کے بعد پانچ اور نام یہ ہیں۔ حضرت ابو الدرداء، خلیفہ سوم حضرت عثمان،

تمیم داری، عبادہ بن الصامت اور ابو ایوب انصاری۔ خلیفہ چہارم حضرت علیؓ اور عبد اللہ بن مسعود بھی جامعین عہد نبویؐ میں ہیں چنانچہ استیعاب جلد دوم ص۴۸۵ پر ہے

روی ربیعة بن عثمان عن محمد بن کعب القرظی قال کان ممن جمع القرآن علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم وهو حی عثمان بن عفان و علی بن ابی طالب وعبد الله بن مسعود من المهاجرین وسالم مولی ابی حذیفة (استیعاب ج۲ ص۴۸۵)

"یعنی ربیعہ بن عثمان نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کی ہے کہ جن لوگوں نے عہد نبویؐ میں جبکہ آنحضرتؐ زندہ تھے قرآن اکٹھا کیا ان مہاجرین میں سے عثمان بن عفان اور علی ابن ابی طالب اور عبد اللہ ابن مسعود اور سالم مولی ابی حذیفہؓ بھی شامل ہیں۔"

اس طور پر جامعین مرتب نسخوں کی تیرہ ۱۳ ہو جاتی ہے۔ اس فہرست میں مجھے حضرت ابو بکر اور حضرت عمرؓ کے نام نہیں ملے۔ لیکن چونکہ یہ حضرات بلاشبہ کاتبین وحی میں داخل ہیں مجھے اس کا یقین کامل ہے کہ انہوں نے بھی نسخے تیار کئے ہوں گے۔

علاوہ بریں مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ جتنی تعداد کاتبین وحی کی تھی اتنے ہی نسخے قرآن مجید کے مرتب ہوئے ہوں گے لیکن باوجود اپنے اس یقین کے میں ان کو شمار نہیں کرتا۔ مگر ذیل میں ایسے حوالے پیش کرتا ہوں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مرتب بشکل کتاب نسخے قرآن مجید کے عہد نبویؐ میں بکثرت موجود تھے جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد وفات چھوڑا۔

(۱) صحیح مسلم جلد دوم ص۹۲ پر ہے:۔

نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم ان یسافر بالقرآن الی ارض العدو۔ (مسلم ج۲ ص۹۲)

"یعنی حضورؐ نے سفر میں قرآن مجید کے نسخوں کو غنیم کے ملک میں لیجانے سے منع فرمایا"

۲- مؤطا امام مالک مطبوعہ دہلی ص۷۹، الامر بالوضوء لمن مس القرآن میں ہے:۔

مالك عن عبد الله بن ابی بکر بن حزم ان فی الكتاب الذی کتبه رسول الله لعمرو بن حزم ان لا یمس القرآن الا طاهر۔ (مؤطا امام مالک ص۹۰ (مطبوعہ مصر)

"یعنی جو شخص قرآن چھونا چاہے اس کے لئے وضو کا حکم ہے۔ امام مالک عبد اللہ بن ابی بکر بن حزم سے روایت کرتے ہیں کہ ان ہدایات میں جو آنحضرتؐ نے ابن حزم کے لئے تحریر فرمائیں یہ بھی تھا کہ کوئی شخص قرآن مجید کو بغیر وضو کے ہاتھ نہ لگائے۔"

(۳) کنز العمال جلد اول ص۱۳۴ پر ہے:۔

لا تغرنکم هذه المصاحف المعلقة۔ (کتاب مذکور جلد اول ص۱۳۴ مطبوعہ مصر)

"یعنی آنحضرتؐ نے کسی جگہ قرآن مجید کے نسخے لٹکے ہوئے دیکھ کر فرمایا کہ لوگو تم ان سے دھوکہ میں نہ پڑ جانا یعنی محض ان کا پڑھنا ہی کافی نہیں بلکہ عمل کی بھی ضرورت ہے"

(۴) سنن ابی داؤد جلد اول ص۲۶۴ (مطبوعہ نولکشور ۱۸۷۷ء)

وانی قد ترکت فیکم ما لن تضلوا بعده ان اعتصمتم به کتاب الله۔ (سنن ابی داؤد ج۱ ص۲۶۴)

"یعنی آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میں تمہارے اندر ایک ایسی چیز قرآن چھوڑے جاتا ہوں کہ جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہیں ہو سکتے اگر تم اسکو مضبوط پکڑلو۔"

یہ فرمانا اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے کہ جب قرآن مجید کتابی صورت میں ہر شخص کی دسترس کے اندر ہو۔

(۵) صحیح بخاری جلد سوم ص۱۴۳ پر ہے:۔

عن عبد العزیز بن رفیع قال دخلت انا وشداد بن معقل علی ابن عباس فقال له شداد بن معقل اترك النبی من شیء قال ما ترك الا ما بین الدفتین۔ قال ودخلنا علی محمد بن الحنفیة فسألناه فقال ما ترك الا ما بین الدفتین۔ (صحیح بخاری ج۳ ص۱۴۳)

"یعنی عبد العزیز بن رفیع کہتے ہیں کہ میں اور شداد بن معقل حضرت ابن عباسؓ کے پاس گئے تو شداد نے ان سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ نے کوئی چیز ترکہ میں چھوڑی ہے انہوں نے جواب دیا نہیں بجز اس کے جو دو پٹھوں کے درمیان ہے پھر ہم محمد بن الحنفیہ کے پاس گئے اور ہم نے سوال کیا تو انہوں نے بھی جواب دیا کہ آنحضرتؐ نے کوئی چیز نہیں چھوڑی بجز اس کے جو دو پٹھوں کے درمیان ہے۔"

ان دونوں جوابوں سے علاوہ قرآن مجید بصورت کتاب لکھے ہونے کے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جلد بندی کا دستور ہو چکا تھا + (باقی)

اسلام اور آزادی!

(مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ)

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔

اسلام آزادی کا سب سے بڑا حامی اور علمبردار ہی نہیں بلکہ وہی اور صرف وہی حقیقی جامع اور مکمل آزادی کا پیغام لے کر دنیا میں آیا ہے، اگر دنیا اسلام سے روشناس نہ ہوتی تو آزادی کا کوئی مفہوم ذہنوں میں اور اس کا کوئی عملی نقشہ آنکھوں میں نہ سما سکتا۔ کیونکہ عقل کی تگ و تاز کی حد تک آزادی کے معنی کوٹھی بنگلہ۔ کیک پیسٹری۔ توس، مکھن، کھیل تماشہ۔ گانا بجانا۔ آلات لہو و لعب نفسانی عیش و نشاط۔ ملکوں میں آمد و رفت۔ ہوائی یا بری و بحری سیر و سیاحت، پارٹی فیلنگ اور اس سے حریفوں کی شکست۔ استعمار اور جوع الارض مخصوص مفادات کو سامنے رکھ کر وضع قانون، اور قانونی داؤ و پیچ کے پردوں میں اقوام و طبقات کو بے بس اور بے حق ٹھیرا دینے کے نہیں ہیں۔ ورنہ غلامی اور غلام سازی کے لفظ کے لئے کوئی معنی باقی نہ رہیں گے۔ بلکہ آزادی کے معنی حق و صداقت، عدل و انصاف، اور ایثار و رواداری کے سچے جذبات کے تحت بے بسوں کی بے بسی رفع کرنے، ضعیفوں کو ابھارنے، بے کسوں کو سہارا دینے، ظالموں سے دبے ہوؤں کو اوٹھا دینے اور حدود سے گذر کر اوبھرے ہوؤں کو اتار لانے اور بالفاظ دیگر اونچ نیچ کا فرق اٹھا کر سب کو حقوق کے لحاظ سے مساوی سطح پر لے آنے کے ہیں۔ تاکہ ضعیف مظلوم نہ بننے پائے، اور قوی کو ظلم و زیادتی کا موقع نہ ملے۔ پس آزادی کا حاصل بلا روک ٹوک پوری قوۃ و قدرت کے ساتھ ادائے حقوق نکل آتا ہے جس سے ظالم کے ہاتھ کٹ جائیں اور مظلوم کی بے دست و پائی ختم ہو جائے آزادی کے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر اسلام کا نصب العین دیکھیے تو وہ یہ ہے کہ:-

انّ فرعون علا فی الارض وجعل اھلھا شیعا یستضعف طائفة منھم یذبح ابناءھم ویستحیی نساءھم انہ کان من المفسدین و نرید ان نمنّ علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم الوارثین و نمکن لھم فی الارض و نری فرعون و ھامان و جنودھما منھم کانوا یحذرون۔

”فرعون زمین میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف قسمیں (پارٹیاں) کر رکھا تھا کہ ان میں سے ایک جماعت کا زور گھٹا رکھا تھا ان کے بیٹوں کو ذبح کراتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔ واقعی وہ بڑا مفسد تھا۔ اور ہم کو یہ منظور تھا کہ جن لوگوں کا زمین میں زور گھٹایا جا رہا تھا ہم ان پر احسان کریں اور ان کو پیشوا بنا دیں اور ان کو مالک بنا دیں۔ اور ان کو زمین میں حکومت دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے اہالی و موالی کو، (زوال قوۃ و شوکت کے) وہ واقعات دکھلا دیں جن سے وہ بچاؤ کر رہے تھے۔“

اس کا حاصل وہی نکلا کہ ضعیفوں کو ابھارا جائے اور ظلم پسند زور آوروں کو گرایا جائے۔ ضعیفوں کے جو حقوق طاقتوروں نے زور و قوۃ کے بل بوتے پر سلب کر رکھے تھے وہ ان کے دانتوں کے نیچے سے نکلوائے جائیں اور ضعیفوں کو واپس کئے جائیں تاکہ کمزور آزادی کا سانس لے سکے اور وقت کے فرعون و ہامان اپنی اصلی حد پر آجائیں ورنہ ختم ہو جائیں۔

اگر آزادی کے یہی معنی ہیں اور شوکت و قوۃ کا یہی مقصد ہے (اور بلاشبہ یہی ہے نہ کہ فراعنۂ وقت کے وہ نفسانی مقاصد جس کے عنوانات کی فہرست ابھی سطور بالا میں گذری) تو پھر اسلام کے سوا کون ہے جو اس مقصد کو دیانت و اخلاق کے ساتھ دنیا میں لیکر آیا ہو۔؟

اِس سے انکار نہیں کہ دُنیا کی کسی ملت نے بھی غلامی کا پروگرام اپنے افراد کو نہیں دیا لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ آزادی کے نعرے کے بعد حقیقی آزادی کے مکمل پروگرام پیش کرنے کی بھی کسی ملت نے زحمت نہیں اوٹھائی۔ پس ملتوں کے دعوے کچھ بھی ہوں لیکن اُن کے پاس آزادی کا وہ جامع پروگرام ہی موجود نہیں جس سے آزادی کا ذکر کردہ مقصد حاصل ہو جائے۔ اسلام نے اگر ایسی آزادی کا دعویٰ کیا ہے تو اُس کے عین مطابق علمی اور اخلاقی پروگرام بھی سامنے رکھا ہے۔ اِس لئے دعوائے آزادی میں اُسی کو سچا مدعی کہا جائیگا جو دعوے کے ساتھ عملی ثبوت بھی پیش کرے۔

آزادیٔ ضمیر

اگر غور کیا جائے تو حقیقی آزادی وہی ہو سکتی ہے جس میں بے جا دباؤ سے کلیۃً چھٹکارا میسر ہو اور یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ پہلے انسان کا دل و دماغ اور ضمیر آزاد ہو ضمیر کی آواز اور رائے آزاد ہو۔ عقل و فہم اور شعور و ادراک آزاد ہوں تاکہ جو کچھ وہ سمجھے خود اپنی بصیرت سے سمجھے دوسرے کے دباؤ اور جبر و قہر سے نہ سمجھے اور پھر جو کچھ اس سمجھے ہوئے کے مطابق عملدرآمد کرے وہ اُسی کا عملدرآمد کہلائے۔ انسان کی ساری آزادیوں کے سلسلے اسی باطن انسان سے چلتے ہیں یہ آزاد ہے تو اُس کی پوری دُنیا آزاد ہے، ورنہ وہ آزاد ہو کر بھی غلام ہے اور اُس کی پوری دُنیا غلام ہے۔

اسلام نے سب سے زیادہ زور انسان کے باطن کی آزادی پر صرف کیا ہے اور اُس کے عقل و فہم کو اس حد تک آزادی بخشی ہے کہ خود اسلام کے منوانے میں بھی اُس کے باطن پر کسی خارجی اثر کا دباؤ ڈالنا گوارا نہیں کیا۔ مادی طاقتیں تو بجائے خود ہیں۔

معجزہ جو خدا کا فعل ہے اور جو نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے اُسے بھی دلیل نبوۃ تو ٹھیرایا ہے لیکن دلیل صداقت مسائل نہیں بنایا۔ کیوں کہ مسائل کی حقانیت استدلال اور حجۃ و برہان سے واضح ہوتی ہے، خوارق سے ظاہر نہیں ہو سکتی بغیر حجۃ و دلیل محض خوارق کے زور سے کسی چیز کو منوانا طاقت کے زور سے منوانا ہے جسے اکراہ و اجبار کہا جاتا ہے جس سے مسئلہ کی حقیقت واضح نہیں ہو سکتی کہ اُس کے ردّ و قبول کا فیصلہ کیا جائے۔ اگر ایک شخص یہ دعویٰ کرے کہ نماز اور زکوٰۃ حق ہے، حج اور روزہ ضروری ہے۔ نکاح و طلاق کا فلاں طریقہ صحیح ہے بیع و شراء کا فلاں ڈھنگ درست ہے اور فلاں ناجائز۔ امن و جنگ کے یہ اوقات و مواقع مناسب ہیں اور وہ مناسب نہیں، اور دلیل یہ بیان کرے کہ میں آنکھ کے اشارے سے بلڈنگیں منہدم کر سکتا ہوں یا میں مُردے زندہ کر سکتا ہوں یا میں پرندوں کی بولیاں سمجھتا ہوں، تو ظاہر ہے کہ ان خوارق سے اُس کی معنوی قوت ضرور کھل جائے گی مگر مسائل کی معقولیت اور غیر معقولیت کا اس سے فیصلہ نہ ہوگا۔ کیا ضروری ہے کہ دیواروں کے انہدام، احیاءِ موتیٰ اور منطق الطیر کے سمجھ لینے سے مسئلہ میں معقولیت بھی آجائے۔ ظاہر ہے کہ محض دیوار گرا دینے سے کسی مسئلہ کو منوانا عقل پر دباؤ ڈالنا ہے کہ وہ بلا دلیل مسئلہ کو تسلیم کر لے کیونکہ مسئلہ کی معقولیت کا تعلق دلیل سے ہے نہ کہ خوارق کے ظہور سے خارق سے پیغمبر کا منجانب اللہ تو ضرور واضح ہو جائے لیکن یہ ضروری نہیں کہ پیغمبر کے لائے ہوئے مسائل کی معقولیت بھی ان خوارق سے ذہن میں آجائے بلکہ اُن کا معقول اور موافق فطرۃ ہونا دلائل سے واضح ہوگا معجزات سے نمایاں نہ ہوگا۔ پس اگر خوارق ہی سے مسائل کی معقولیت کو بھی زبردستی منوایا جاتا۔

آزادیٔ عقل و فہم

اور عقلی بصیرۃ کو استدلال کی راہ سے گذر کر مسئلہ کی معقولیت تک پہونچنے کی اجازت نہ دی جاتی تو بلاشبہ یہ عقل پر ایک بے جا دباؤ ہوتا جس سے عقل کی آزادی میں فرق آجاتا درحالیکہ اسلام نے عقل کو آزادانہ سوچ بچار کرنے کا موقعہ دیا ہے۔ اس لئے خوارق کو نبی کی نبوۃ کی دلیل تو کہا گیا لیکن مسائل کی معقولیت سمجھنے کے لئے اُنھیں دلیل نہیں ٹھیرایا گیا۔ بلکہ اُس کے لئے کسی کے مبعوث من اللہ، اور فرستادۂ خدا ہونے کے لئے معجزہ اور خرق عادۃ ہی بہترین دلیل بن سکتا تھا۔ حجۃ و برہان اور فراسۃ و وجدان کا راستہ کھولا گیا کہ مسائل کی صداقت تولنے کے لئے یہی حقیقی ترازو اور قرطاس مستقیم ہے۔ چنانچہ قرآن نے ایک ماننے والے کا پاکیزہ وصف یہ نہیں بیان کیا کہ وہ محض کسی قوۃ یا محض معجزہ اور خوارق کے دباؤ سے مسائل کو تسلیم کرتا ہے خواہ اُسے غیر معقول بھی جانتا ہو۔ بلکہ یہ بیان

کہا گیا کہ:۔

والذین اذا ذکروا بآیات ربھم لم یخروا علیھا صما وعمیانا۔

"اور (یہ مومن بندے) ایسے ہیں کہ جب وقت اُن کو اللہ کے احکام کے ذریعے سے نصیحت کی جاتی ہے تو اُن پر بہرے اندھے ہو کر نہیں گرتے (بلکہ عقل و فہم کیساتھ متوجہ ہوتے ہیں۔ تاکہ ماننے کے ساتھ اُن کا سمجھ لینا بھی ساتھ ساتھ رہے۔"

پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) کو یہ کہدینے کا ارشاد ہوا کہ:۔

قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ۔ علی بصیرۃ انا و من اتبعنی و سبحان اللہ وما انا من المشرکین۔

"آپ فرما دیجئے کہ یہ میرا طریق ہے، میں خدا کی طرف اس طور سے بُلاتا ہوں کہ میں دلیل پر قائم ہوں میں بھی اور میرے ساتھی بھی اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں (کہ کسی آبائی رواج پر پچھلوں کی ریت کو بے دلیل ماننے اور منوانے جاؤں)"

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جہاں اپنی صداقت اور مبعوث من اللہ ہونے کی دلیل میں بردوسلام کا معجزہ پیش کیا وہاں خدا کی توحید منوانے کے لئے بجائے خرق عادۃ کے نمرود سے استدلالی بحث و مناظرہ فرمایا جو حجت و برہان کی لائن تھی کسی معجزہ سے اُسے چپ کرنے کی سعی نہیں فرمائی۔ موسیٰ علیہ السلام نے جہاں عصاء اور ید بیضاء کے چمکتے ہوئے خوارق عادۃ نشان پیش کئے تاکہ اُن کا پیغمبر ہونا واضح ہوجائے، وہاں مسائل سمجھانے کے لئے کسی معجزے کو استعمال نہیں کیا۔ بلکہ فرعون سے مکالمہ حجۃ و برہان سے کیا جس کی تفاصیل قرآن حکیم میں محفوظ ہیں۔ ٹھیک اسی عنوان پر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جہاں ہزارہا معجزات دکھلائے ہیں وہاں مسائل کے باب میں صرف ایک ہی معجزہ پیش کیا اور وہ قرآن تھا جو حجت و برہان اور عقلی و حسی طرق استدلال سے بھرپور ہے پس آپ کو بوجہ خاتم النبیین ہونے کے طریق استدلال بھی معجزانہ ہی انداز کا دیا گیا۔ جس سے واضح ہے کہ مسائل کا قابل فہم اور قابل سماعت ہونا فطری اور بدیہی دلائل سے واضح ہوتا ہے خوارق سے نہیں، خوارق اور معجزات کے زور سے مسائل کا منوانا ایک ایسا دباؤ ہوتا جس سے عقل و خرد

کی آزادی سلب ہوجاتی اور انسان کو عقل اور فکر کا دینا نہ دینا برابر ہوجاتا۔ پس اسلام نے آزادی کا سبق باہر ہی باہر سے نہیں پڑھایا۔ بلکہ انسان کے اندرون کو سب سے پہلے آزادی کی دولت بخشی ہے۔ اُس کے ضمیر کو آزاد کیا۔ اُس کی عقل کو آزاد کیا، اُس کے فہم و فکر کو آزاد کیا۔ اور بالفاظ مختصر انسان کی حقیقت میں آزادی کا تخم بو دیا اور اُسے مجسم آزادی بنا دیا۔ بہرحال ضمیر کی آزادی اسلام کا پہلا قدم ہے جس کے اوپر سے اُس نے تمام خارجی اثرات حتیٰ کہ خدائی افعال (معجزات) تک کے دباؤ کو بھی باقی نہیں رکھا۔

آزادیٔ رائے

آزادیٔ ضمیر کے بعد ما فی الضمیر یعنی رائے کی آزادی کا مقام آتا ہے۔ اگر دیا تھا ضمیر ایک بات کو حق مان رہا ہے تو اُسے برملا اظہار کا حق دینا بھی اسلام ہی کی بلند حوصلہ فطرۃ کا کام تھا۔ ضمیر کی آواز اور دل کی مخلصانہ رائے ایک اپیل ہے جو بند رہنے کے لئے دل میں نہیں اُبھاری جاتی، بلکہ کھلنے اور کھل کر سامنے آنے کے لئے اُٹھائی جاتی ہے۔ کسی بڑی سے بڑی چیز کو حق نہیں دیا گیا کہ وہ ضمیر کی آواز اور سچے دل سے اُبھری ہوئی رائے کے اظہار پر کوئی پابندی عائد کردے۔ اُس کی تصدیق و تکذیب یا تصویب و تردید کا حق کے ساتھ ہر ایک کو اختیار ہے۔ لیکن اُسے اُبھرنے نہ دینے کا کسی کو حق نہیں۔ اگر رائے کو آزاد نہ کہا جاتا تو ضمیر کی آزادی کے کوئی معنی نہ تھے۔ حتیٰ کہ ایک عام انسانی رائے پر پیغمبر کی رائے کو بھی رائے کی حیثیت سے اثر انداز ہونے کا موقعہ نہیں دیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ کو ارشاد فرمایا کہ وہ حضرت مغیث سے نکاح کا تعلق منقطع نہ کریں۔ بریرہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ امر ہے یا مشورہ؟ فرمایا نہیں مشورہ و رائے ہے۔ عرض کیا تو میں آزاد ہوں یہ رائے مانوں یا نہ مانوں۔ اور بالآخر نہیں مانیں۔ ایک طرف پیغمبرؐ کی رائے ہے جو خاتم النبیین ہونے کے علاوہ اعقل الناس بھی ہیں، دوسری طرف ایک عورت کی رائے ہے جس کی جنس ناقص العقل شمار کی گئی ہے لیکن اسلام کی بخشی ہوئی آزادیٔ رائے کا مقام اس حد تک بلند ہے کہ ایک عورت کی رائے پر پیغمبرؐ کی رائے کسی ادنیٰ دباؤ ڈالنے کی

مجاز نہیں ٹھیرائی گئی۔

بہرحال اسلام کی آزاد فطرۃ نے انسان کی آزادی کے لیے سب سے پہلے اوس کے باطن کو آزادی بخشی ہے۔ اُس کی عقل اوس کے ضمیر، اور اُس کی رائے کو آزاد رکھا ہے، اور اُس پر کسی ایسے دباؤ کو گوارا نہیں کیا جو اُس کے فطری اُبھار اور تقاضوں کو پامال کردے۔

ظاہر ہے کہ جو اسلام انسانی باطن پر نبوۃ اور معجزات یعنی فعل نبوی اور فعل خداوندی کے دباؤ کو بھی برداشت نہیں کرتا تاوقتیکہ انسانی ضمیر خود ضمیر ہی کے رُجحان اور اپنے ہی اندرونی دباؤ سے اُسے واجب القبول نہ سمجھ لے۔ تو وہی اسلام اُسی انسانی ضمیر اور بشری باطن پر اینٹ پتھر کے دباؤ، سونے چاندی اور زروجواہر کی ڈھیریوں کے دباؤ، تیروتفنگ اور بم وگیس کے دباؤ، کسی کی رسمی قربانی یا ہنگامی اقتدار کے دباؤ کو کب گوارا، اور برداشت کرسکتا ہے، اور تو اور وہ تو خود اپنے کو بھی نہ تلوار کے زور سے کسی کے اندر اُتارنا چاہتا ہے اور نہ کسی کو کسی قسم کے رسمی دباؤ سے اپنے اندر گھس آنے اور اُتر پڑنے کی اجازت دینا چاہتا ہے۔ اُس نے صاف اعلان کردیا ہے کہ:۔

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی۔ "دین میں زبردستی نہیں، ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہوچکی ہے"

پیغمبر صلعم کو ہدایت دی گئی کہ:۔

افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مؤمنین۔ "سو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کرسکتے ہیں کہ وہ ایمان لے ہی آویں"

پس جو اسلام دین تک کے بارے میں دلوں اور ضمیروں کو آزادی بخش رہا ہے وہ رائے اور طبیعت کے اصلی تقاضوں کو کب پابند اور غلام رکھنا پسند کریگا؟ پس سب سے پہلے اسلام نے اندرونِ انسان ہی میں آزادی کا دیا روشن کیا، اور انسانی ضمیر انسانی رائے اور انسان کے دل کی آواز کو دل میں اُبھرنے اور اُبھر کر باہر نکلنے میں آزادی دی۔

ظاہر ہے کہ بیرونی آزادی اندرونی ہی کی آزادی کے تابع ہوتی ہے اگر ضمیر آزاد ہے تو اُس کا بیرونی ماحول بھی آزاد ہو کر رہتا ہے بشرطیکہ ضمیر میں واقعی حریت و آزادی اُتری ہوئی ہو اور وہ ضمیر کی آواز بنی ہوئی ہو لفظی ترجمانی نہ ہو جس میں کوئی حقیقت نہ ہو۔ پس آزادی ہو یا غلامی پہلے اندرونِ نفس میں آتی ہے پھر اُس کا بیرون آزاد یا غلام بنتا ہے۔ قرآن حکیم نے بھی سائنٹیفک حقیقت وا شگاف فرمادی کہ:۔

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم۔ "واقعی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت میں تغیر نہیں فرماتے جب تک وہ لوگ خود اپنے نفوس (کے اندرونی احوال) کو نہیں بدلتے"

پس باہر آزادی جب ہی نمایاں ہوتی ہے جب اندر آچکتی ہے، باہر انقلاب جب ہی رُونما ہوتا ہے جب اندر آلیتا ہے۔ باہر غلامی اُسی وقت آتی ہے جب نفوس کے اندر وہ سرایت کرچکتی ہے۔

اگر ایک قوم آزاد ہونا چاہتی ہے تو پہلے اُسے اپنے من میں آزاد ہوجانا پڑے گا۔ پھر جس نوع کی آزادی اندر آئے گی اُسی نوع کی باہر نمایاں ہوگی۔ اِس لئے اسلام نے باہر آزادی کی فضاء پیدا کرنے کے لئے پہلے اندرونِ انسان میں آزادی اور جرأت کی فضاء پیدا کی تاکہ اُسی جرأت وبے باکی سے اُس کی بیرونی آزادی بھی فضاء پر محیط ہوجائے، اور اس طرح اسلام صرف رسمی آزادی کا داعی اور علمبردار نہیں بلکہ باطنی اور بُنیادی آزادی وحریت کا منادی ہے جس نے رسمی اور معنوی، صوری اور حقیقی، دونوں قسم کی آزادیوں کا انسانوں کو سبق دیا ہے!

پس باطن میں تو اسلامی آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کا باطن اور ضمیر ہر ماسویٰ سے آزاد ہوکر حق کا پابند ہوجائے، ہر غیر اللہ کی حکمرانی اور قہرمانی سے آزاد ہوکر حق کی حکمرانی کے نیچے آجائے۔ اگر یہ اختیارِ حق اور ردِ باطل ضمیر کا جوہر بن چکا ہے جو حقیقی آزادی کا ماحصل ہے تو ایسے ضمیر سے اسی قسم کی آزادی باہر بھی پھیلے گی۔ پرستارانِ حق کا غلبہ ہوجائے گا، اور پرستارانِ باطل کی شکست، صدیقوں اور صالحوں کی روش پھیل جائے گی، اور فرعونوں اور ہامانوں کے طور طریقے مسدود ہوجائیں گے۔ لیکن اگر حق سے آزاد ہوکر نفس کی پیروی اور غیر اللہ کے دباؤ کے آگے دل اور ضمیر شکست کھاچکا ہو یعنی ضمیر خود اپنے سے مطمئن نہیں بلکہ بیرونی اثرات سے متأثر اور اپنی موت سے خود ہی خجل ہے، گویا حق سے آزاد اور باطل کا غلام ہے (جو اسلامی آزادی کی ضد ہے) تو اُس نوع کی آزادی باہر بھی نمایاں ہوگی۔ فرعون و ہامان برسرِ اقتدار ہوں گے، صلحاء و صدیقین بے یار و مددگار بن جائیں گے

اور یہ آزادی یقیناً عالم کی آبادی نہ ہوگی بلکہ بربادی ہوگی جس کو احادیث صحیحہ میں علاماتِ قیامت (جن کا دوسرا نام فتن ہے جو اقوامِ عالم اور عالم کے لئے ستم قاتل کا حکم رکھتے ہیں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے علاماتِ قیامت دریافت کیں تو آپ نے فرمایا:۔

ان تلد الامۃ ربتہا وان تری الحفاۃ العراۃ رعاء الشاء یتطاولون فی البنیان	"(قیامت اور عالم کی تباہی اس وقت قریب ہوگی جب) باندی اپنی مالک کو جننے لگے یعنی لڑکیاں تک ماں پر حکومت کرنے لگیں جو لڑکوں سے کہیں زیادہ ماں کی مطیع ہوتی ہیں (یہ تباہی ہے معیشتِ منزلی کی) (اور سیاستِ مُدن یعنی مُلکی معاملات کی بربادی کی صورت یہ ہے کہ) تم دیکھو کہ ننگے پیرے ننگ سرے ذلیل قسم کے لوگ) بکریاں چرانے والے اہیر یعنی کمینہ قسم کے لوگ اونچی اونچی بلڈنگوں میں شیخیاں مارنے لگیں۔"

یعنی کمینے برسرِ اقتدار آجائیں اور حکمت پسند شرعاً جوتیاں چٹخاتے نظر آئیں۔ تو یہ اقتدار بظاہر آزادی ہوگا۔ مگر بہ نگاہِ غور ذلیل قسم کی غلامی ہوگا جو غلامیٔ حق کے بجائے غلامیٔ نفس کی دلدل میں پھنسا کر انجام کار عام تباہی کی طرف ملتوں کو دھکیل دے گا۔ بہرحال اسلام کی نگاہ میں آزادیٔ باطن کے معنی ضمیر کی آزادی۔ عقل و خرد اور فہم و فکر کی آزادی ہے جس سے انسان بنا ساتِ خود اپنے ضمیر کی آواز اٹھانے میں جری' اور بے باک ہوجائے۔ اور آزادیٔ ظاہر کے معنی ضمیر کی اس آواز کے مطابق عملی اقدام میں ایسی جرأت اور قوت پیدا ہو جانا ہے جو امرِ حق کے نافذ کرنے میں کسی پس و پیش کی شکار نہ ہو اور انسان کو نہ لومۃ لائم کی پرواہ ہے نہ نصیح ناصح کی۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں، کہ اسلام آزادی لے کر ہی نہیں آیا بلکہ آزادی کا مفہوم سمجھانے کے لئے بھی آیا ہے۔ اسلام ظواہر ہی کو آزاد کرانے نہیں آیا' بلکہ بواطن اور ضمائر کو بھی آزادی بخشنے کے لئے آیا ہے۔ اسلام نے آزادی کے معنی سمجھاتے ہوئے پہلے غلامی کے معنی سمجھائے ہیں کہ وہ نفس و شیطان کی پیروی کا ایک مختصر عنوان ہے۔ خواہ کوئی فرد اس پیروی کا شکار ہو یا جماعت۔ پھر اسی منفی پہلو سے آزادی کے معنی سمجھائے کہ وہ حق کی غلامی کا دوسرا نام ہے' پس اس نظریہ پر جو حق کا غلام ہوا وہی آزاد ہوا' اور جو اس سے آزاد ہوا وہی غلام ہوا۔ اس سے واضح ہوا کہ آزادی کے معنی اسلام میں شتر بے مہار ہونے کے نہیں بلکہ حجت و برہان سے پابندِ حق بنجانے کے ہیں۔

آج کے دور میں کوئی بھی قوم یا مُلک اگر آزاد ہو تو اس کی آزادی اور غلامی کا فیصلہ اسی اصول سے کیا جائے گا کہ اگر وہ آزادی کے بعد اپنے ضمیر کی سیدھی سچی آواز کے تحت مخلوقِ خدا سے اونچ نیچ اٹھانے میں بے باک ہے' اسے ضعیف کو قوی کرنے اور اس کے حقوق واپس دلانے اور زور آور ظالم کے پنجۂ استبداد کو توڑ کر اس سے غصب کردہ حقوق نکال لینے میں کوئی جھجک اور کوئی رکاوٹ سدِّ راہ نہیں ہوتی تو وہ آزاد ہے ورنہ قطعاً غلام ہے۔ اگر اتفاق سے کسی غیر کا نہیں' تو اپنے ذلیل نفس اور اس کی ہوا و ہوس کا غلام ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہی اندرونی غلامی چند ہی دن میں بیرونی غلامی کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اس لئے وہ ظاہری آزادی بھی دیرپا ثابت نہیں ہوتی۔ ہاں اگر آزاد شدہ مُلک کا ضمیر آزاد ہے اور اس کے عدل و مساوات کا سچا جذبہ اور اس پاکیزہ جذبہ کے بے لاگ اقدامات کسی بیرونی دباؤ کو نہیں مانتے اور کسی ملامت سے متاثر نہیں ہوتے تا آنکہ اس راہ عدل و مساوات میں قومیت' رنگ' نسل' وطن' ہوسِ زر' ہوائے اقتدار اور غلط قسم کا ماحول کوئی بھی اس کے جذبہ و عمل میں خلل انداز نہیں ہوتا تو وہ مُلک آزاد اور وہ قوم آزادی سے بہرہ مند ہے اور بلاشبہ ضمیر کی یہ آزادی باہر کی اس آزادی کو زیادہ سے زیادہ مضبوط۔ زیادہ سے زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ سے زیادہ دیرپا بناتی رہے گی۔ پس حقیقی آزادی وہی ہوگی جس میں ظاہر و باطن یکساں طریق پر آزاد ہوں' اس کے برعکس مقابلہ ہو کہ ظاہر بظاہر آزاد ہو' اور دلوں میں غلامی کا چور نقب زنی کر رہا ہو۔ یا زبانی حقیقی آزادی کے ادعاء میں رطب اللسان ہوں مگر دلوں میں اس کے برعکس جذبات کا طوفان بپا ہو۔ یرضونکم بافواھھم وتابیٰ قلوبھم واکثرھم فاسقون

اسلام بھی جامع آزادی لے کر دنیا میں آیا اور جونہی اس نے آزادی کا یہ غلغلہ بلند کیا اور اس کی آواز پر پاک ضمیر انسانوں نے اپنے ضمیر کی آواز سے لبیک کہا

وہ بھی پسماندہ ابھر پڑے۔ پست بلند ہوگئے اور بلند نیچے کی طرف آ گئے غلام اور آقا میں فرق نہ رہا۔ یتیم بے کسی کا لبادہ اتار کر ناز و نعم کے خلعت جاں بخش میں آگیا۔ مظلوم کی فریادیں عرش سے ٹکرانے لگیں، صنف نازک باندیوں سے حُرّہ ہوگئیں، بے کس اور لاوارث دوسروں کے مورث بن گئے، جنھیں سونے کے لئے فرشِ خاک بھی مشکل سے میسّر آتا تھا وہ کتان کے رومالوں سے ناک صاف کرنے لگے، اور جو خود ہل کر اپنی خدمت کرنا بھی عار جانتے تھے وہ خادم خلق اللہ بن گئے۔ غرض اسلام نے آزادی سے جو انقلاب برپا کیا وہ اونچ نیچ اور من و تو کے امتیاز کا انقلاب نہ تھا بلکہ اونچ نیچ مٹانے اور من و تو قصے ختم کرنے کا انقلاب تھا۔ قانونی مساوات۔ تعلیمی یکسانی۔ مالی توازن جاہی ہمرنگی۔ امیر و غریب کے سنگم۔ اونچے اور نیچے کے ملاپ۔ آقا و غلام کی ہم آہنگی۔ شاہ و گدا کی یک منظری کا انقلاب تھا۔ جو اس کے بغیر ناممکن تھا کہ یہ امیر و غریب، شاہ و گدا، اور اونچ نیچ افراد بجائے ایک دوسرے کو دیکھنے کے سب مل کر کسی ایسی ذات کو دیکھنے لگیں جو ان سب سے بالاتر ہے۔ اور اس طرح اُن کا رُخ ایک دوسرے کی طرف ہونے کے بجائے صرف ایک مرکز کی طرف ہو جائے جو واحد و قیوم ہو۔

پس اسلام نے آزادی اور آزاد روشی کی یہ حقیقت جس میں مساوات کے ساتھ ایک دوسرے کی خدمت بلکہ فدویت کا جذبہ کارفرما تھا، خود انسان کے نفس کی عظمت یا اصطلاحی خودداری سے نہیں اُبھاری، بلکہ ہر ہر نفس کی مخفی عظمت کو مٹا کر حق کی عظمت دل میں سمو کر پیدا کی۔ اس لئے اسلامی آزادی کے معنی غلامیٔ نفس، یا غلامیٔ غیر اللہ کے نہیں بلکہ غلامیٔ حق کے ہیں۔ پس آزادی کا لفظ تو اسلام اور غیر اسلام میں مشترک ہے لیکن اُس کے معنی اسلام اور غیر اسلام میں ایک دوسرے سے بالکل جُدا اور باہم بعید تر ہیں۔

"اسلام اور آزادی" کا عنوان جب سامنے آئے تو اس تفصیل کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے تاکہ دوسروں کی لفظی آزادی سے اسلام کی حقیقی آزادی متمیّز ہو سکے +

اِمدادی پرچوں کا

اعلان!

مولانا اسمٰعیل سلیمان کڑواصاحب نے بندر شیپسٹون، (جنوبی افریقہ) سے ۶ پاؤنڈ (مبلغ ۸۰ روپے) رسالہ "دار العلوم" کی امدادی مد میں عنایت فرمائے ہیں، اس رقم سے عربی مدارس کے نادار طلبہ کے نام سال بھر کے لئے رسالہ جاری کیا جائے گا۔ طلبہ اس قسم کے اعلانات پڑھ کر اجراء رسالہ کے لئے فوراً خطوط لکھتے ہیں۔ مگر ہم نے نظم کو صحیح طور پر قائم رکھنے کے لئے جو شرائط طے کی ہیں ان کی پابندی نہیں کرتے۔ طلبہ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ ان تمام شرائط کی پابندی ضروری ہے، اگر شرائط کا لحاظ نہ کیا گیا تو رسالہ جاری نہیں ہوگا:۔

(۱) اجراء رسالہ کے لئے درخواستیں لفافوں میں آنی چاہئیں کارڈ پر لکھی ہوئی درخواستیں قابلِ غور نہیں ہوں گی۔

(۲) صرف نادار طلبہ ایسی درخواستیں روانہ کریں۔

(۳) ہر درخواست کنندہ اپنی زیرِ تعلیم کتابوں کا حوالہ، اور درخواست کے ساتھ اپنے مدرسہ کے مہتمم یا صدر مدرس کی تصدیق ضرور روانہ کرے۔

(۴) اپنا پتہ صاف لکھیں۔

(۵) درخواستیں ۲۵؍ دسمبر تک دفتر میں مدیر رسالہ کے نام آنی چاہئیں۔

(۶) جو درخواستیں نامنظور ہوں گی اُنھیں دفتر نامنظوری کی اطلاع نہیں دے گا۔ رسالہ کے عدم اجراء ہی کو درخواست کی نامنظوری کی علامت سمجھنا چاہیئے +

(ناظم رسالہ)

صلی اللہ علیہ وسلم

مسئلہ حیاتُ النبیؐ

دیوبندی مکتبِ خیال کی روشنی میں

(مولانا اخلاق حسین قاسمی الدہلوی)

اس عقیدہ پر تو ساری اُمت کا اتفاق ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم "حیات" ہیں، لیکن وہ حیات کیسی ہے۔؟ برزخی (رُوحانی) یا دنیوی (جسمانی) ـــــ اس کے جواب میں علماء کے دو مشہور مسلک سامنے آتے ہیں:۔

ایک طبقہ جسمانی زندگی کا قائل ہے اور کچھ حضرات صرف رُوحانی اور برزخی زندگی کے۔

پہلا طبقہ کہتا ہے:۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم قبر شریف میں اسی طرح حیات ہیں جس طرح آپ جسم مُبارک کے ساتھ دُنیا میں حیات تھے۔

دوسرا طبقہ کہتا ہے:۔

آپ کی حیات برزخی ہے، جیسی کہ شہداء فی سبیل اللہ کی، لیکن نہ بالکل ان جیسی، بلکہ اُن سے بہت ممتاز اور افضل۔

پہلے طبقہ کی ترجمانی حضرت شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے مدارج النبوۃ میں اس طرح کی ہے:۔

جسمانی زندگی کے دلائل:۔

پہلی دلیل انبیاء علیہم السلام کے اجسام قبروں میں محفوظ ہوتے ہیں۔ زمین کے لئے ممنوع ہے کہ وہ انھیں گلائے یا سڑائے۔

ان اللہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء [1]
"اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام کو کھائے"

قبروں میں جسم اسی لئے محفوظ ہیں کہ اُن کے ساتھ روحوں کا تعلق قائم ہے، اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں ہے۔

حضرت قتادہ (مشہور تابعی) نے جسموں کی حفاظت کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا ہے:۔

بلغنی ان الارض لاتسلط علی جسد الذی لم یعمل خطیئۃ [2]
"مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ زمین اس جسم پر مسلط نہیں کی جاتی"

حضرت قتادہ نے حیات انبیاء کی اصل وجہ کی طرف اشارہ کیا ہے، یعنی جو جسم گناہوں کی آلودگی سے پاک ہیں وہ جسمانی عالم سے جدا ہونے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں اور زمین اُن کا ایک رونگٹا بھی خراب نہیں کر سکتی۔

یہ مسلّم ہے کہ خطاؤں سے حضرات انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی دوسرے کو حاصل نہیں، اس لئے اُن ہی کے اجسام قبروں میں محفوظ ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ اگر قبروں میں جسموں کی حفاظت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ جسمانی زندگی کے ساتھ زندہ ہیں تو پھر انبیاء علیہم السلام کے علاوہ اُن لوگوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا جن کے جسم قبروں میں محفوظ رہتے ہیں۔ مثلاً خود سرورِ عالم نے قرآن کے حافظوں کے متعلق فرمایا:۔

اذا مات حامل القرآن اوحی اللہ تعالیٰ الی الارض
"جب حامل قرآن مر جاتا ہے تو خدا تعالیٰ زمین کو حکم دیتا ہے کہ وہ اُس کا گوشت

[1] زاد المعاد ص ۵۱۹ بحوالہ ابوداؤد ابن ماجہ حاکم ۱۲

[2] تفسیر مظہری بحوالہ طبرانی عن جابرؓ

ان لا تاکل لحمه فقول الارض یارب کیف اکل لحمه وکلامك فی جوفه[1]

نہ کھائے تو وہ کہتی ہے کہ اے پروردگار میں اُس کا گوشت کیسے کھا سکتی ہوں جب تیرا کلام اس کے سینے میں محفوظ ہے۔"

(تفسیر مظہری)

اسی طرح اُحد کے شہیدوں کے متعلق یہ ثابت ہے کہ اُن کی لاشیں اپنے مدفنوں میں محفوظ نکلیں۔ جب واقعہ اُحد کے چالیس[2] سال بعد حضرت معاویہ کے عہد میں میدانِ اُحد میں نہر نکالنے کے لئے زمین کھودی گئی تو حضرت عمرو ابن جموح اور حضرت عبداللہ ابن جبیر انصاری کی لاشیں بالکل تر و تازہ پائی گئیں اور حضرت حمزہ کی لاش پر کدال لگنے سے اُن کے پیر میں سے خون نکلا[3]۔

یہ واقعات بھی صحیح ہیں اور سرورِ عالم کا ارشاد بھی درست ہے لیکن یہ محض جزوی فضیلتیں ہیں جو اظہارِ کرامت کے طور پر خدا تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو عطا فرما دیتا ہے، یہ کوئی عام کلیہ نہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر حافظِ قرآن کا جسم قبر میں لازمی طور پر محفوظ رہتا ہے۔ یا بلا استثناء ہر شہید کے جسم کو قبر میں وہ خاص حفاظت میسر ہوتی ہے جس کا اعلان انبیاء کرام کے متعلق کیا گیا ہے۔

جزوی فضیلت کے خاص خاص واقعات میں اور عام کلیہ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کا جسم پاک قبر میں محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گا ——— جس یقین کے ساتھ ہم اس حقیقت کا دعویٰ کرتے ہیں کسی نیک سے نیک انسان کے بارے میں بھی اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

سرورِ عالم کے جسمِ اطہر کا قبر میں محفوظ ہونا ایک تاریخی حقیقت کے طور پر بھی ثابت ہو چکا ہے، اُس واقعہ سے جو پانچسو ستاون ہجری میں سلطان نورالدین زنگی کے ساتھ پیش آیا، اور جسے مدینہ منورہ کے تمام مورخین جمال مطری، علامہ مجدالدین فیروز آبادی وغیرہ نے اپنی تاریخوں میں بیان کیا ہے[4]۔

دوسری دلیل

عام طور پر موت کے بعد انسان کے جسم میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے، چہرے پر وحشت برسنے لگتی ہے ہاتھ، پیر اکڑ جاتے ہیں، ناک کا بانسا پھر جاتا ہے۔ لیکن سرورِ عالم کا جسدِ اطہر اس قسم کے تمام تغیرات سے محفوظ رہا، وصال کے بعد کسی نے آپ کے روئے انور میں کوئی ادنیٰ فرق بھی محسوس نہیں کیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں:۔

غُسل دیتے وقت میں نے حضورؐ کے جسم میں وہ علامات تلاش کیں جو مرنے کے بعد انسان میں نمودار ہو جاتی ہیں۔ لیکن باوجود تلاش کے میں نے کوئی علامت نہیں پائی۔

اسی پر حضرت علیؓ نے فرمایا:۔

بابی انت وامی ما اطیبك حیا و میتا[5]

"میرے ماں باپ آپ پر قربان! کس قدر پاکیزہ ہے آپ زندگی میں بھی اور موت میں بھی"

ہر دور میں علماءِ اُمت نے اس تاریخی حقیقت کی پوری قوت سے حفاظت کی۔ اگر کسی نے اس کے خلاف کچھ کہا تو اُس کے ایمان میں کلام ہونے لگا۔

وکیع ابن جراح نے اسماعیل ابن ابی خالد سے یہ کہا کہ وفات کے بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیٹ پھول گیا تھا، انگلی مڑ گئی تھی، اور ناخن سبز ہو گئے تھے، کیوں کہ آپ پیر کے دن کے وفات پائے ہوئے بدھ کی رات کو دفن کیے گئے تھے ———

اور اس کی حکمت یہ بیان کی ———

اس کی وجہ یہ تھی کہ صحابہ کی جماعت میں سے جن لوگوں نے آپ کی وفات کا انکار کیا تھا وہ ان علامات کو دیکھ کر آپ کی وفات کا یقین کر لیں۔

وکیع کی یہ باتیں جب مکہ کے والی حاکم عثمان کے پاس پہنچائی گئیں تو حاکم نے وکیع کو حرم سے باہر پھانسی دینے کا حکم دے دیا۔ سفیان ابن ابن عیینہ کو والی مکہ کا یہ فیصلہ معلوم ہوا، انہوں نے آکر وکیع کے لئے سفارش کی، والی مکہ نے ان کی سفارش قبول کر لی اور وکیع مکہ سے مدینہ طیبہ چلے گئے[6]۔

سرورِ عالم کے جسم میں تغیر نمودار ہونے کی روایات کو ابن سعد نے

---

[1] و [2] تفسیر مظہری ۱۲ +

[3] مدارج النبوۃ صفحہ ۵۷۶ ج ۲ - +

[5] ابن ماجہ کتاب الجنائز - ۱۲ [6] نسیم الریاض شرح شفاء صفحہ ۳۹۰ +

طبقات میں نقل کیا ہے، اس کے متعلق حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:۔

"ابن سعد عرصہ سے مفقود تھی، اب اُسے یورپ والوں نے چھپوایا ہے، نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اصل نسخہ کے مطابق ہے یا اس میں اضافہ کر دیا گیا ہے، اس میں امہات المومنین اور حضور کی وفات سے متعلق بعض ایسی روایات موجود ہیں جن کا دوسری اسلامی تصنیفات میں باوجود تلاش کے کہیں پتہ نہ چلا۔ پھر ابن سعد خود بھی کوئی ایسی کتاب نہیں جس کی تمام روایات قابل قبول ہوں، لہٰذا اس کی وہی باتیں قابل اعتبار ہو سکتی ہیں جو تفسیر و حدیث کی دوسری متداول کتابوں میں موجود ہیں، ملا علی قاری نے موضوعات کبیر میں جو قاعدہ لکھا ہے اس کا حاصل یہی ہے۔"

تیسری دلیل
چند احادیث

(۱) پہلی حدیث:۔

الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون[1] "انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نماز پڑھتے ہیں"

(۲) دوسری حدیث:۔

خدا تعالیٰ نے کچھ فرشتے اس کام کے لئے پیدا کئے ہیں کہ وہ زمین پر گشت کریں اور میری اُمت کا درود و سلام مجھ تک پہنچائیں[2]

(۳) تیسری حدیث:۔

امام عبدالحق جو کبار محدثین میں سے ہیں انہوں نے احکام صغریٰ میں حضرت ابن عباس کی ایک صحیح روایت نقل کی ہے، حضور نے فرمایا:۔

"جو شخص اپنے اس مسلمان بھائی کی قبر پر جاتا ہے جس مسلمان کو وہ جانتا تھا، اور جا کر سلام کرتا ہے تو وہ صاحب قبر اسے جواب دیتا ہے۔"

پس جب عام مسلمانوں کے بارے میں یہ ثابت ہے تو حضورؐ تو ہر حال میں افضل و اکمل ہیں[3]۔

(۴) چوتھی حدیث:۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں، حضور نے ارشاد فرمایا:۔

"اگر فرشتے تمہارے اچھے اعمال مجھ تک پہنچاتے ہیں تو میں خوش ہوتا ہوں اور اپنے پروردگار کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اور اگر بُری اعمال پہنچاتے ہیں تو اُن کے لئے دُعائے مغفرت کرتا ہوں۔"

اِن احادیث کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"اِن روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ سرورِ عالم کو اپنی قبر شریف میں حیات حسّی حاصل ہے، نہ صرف حیات معنوی جیسی کہ شہیدوں کو حاصل ہوتی ہے۔"

دوسرے طبقہ میں سے علامہ علاؤ الدین قونیوی جو علماء شافعیہ میں ایک بڑے صاحب تصوّف بزرگ ہیں، حضور کی زندگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ہمارا عقیدہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پروردگار کے پاس جنت الماویٰ میں حیات متعارف سے بہتر حیات کے ساتھ قیام گیر ہیں، اور یہ حالت قبر میں مقیم رہنے کی حالت سے کہیں زیادہ افضل و بہتر ہے۔ اگرچہ حضور نے فرمایا ہے کہ "مومن کی قبر حدِ نگاہ تک وسیع ہوتی ہے" ——— پھر انبیاء علیہم السلام کی قبروں کا کیا کہنا ——— لیکن اس کے باوجود آپ کا جنت الماویٰ میں ہونا سب سے افضل و اعلیٰ حالت ہے۔ چنانچہ خود حضور نے فرمایا ہے کہ میں اپنے پروردگار کے پاس تم سے بہتر حالت میں ہونگا کیوں کہ مجھے میرا رب تین روز کے بعد قبر میں نہیں چھوڑے گا۔"

شاہ صاحب علامہ کے "عقیدہ" پر لکھتے ہیں:۔

"قبر شریف کے قیام" اور "پروردگار کے پاس قیام" ان دونوں باتوں میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے، کیونکہ قبر کی زندگی کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ خدا تعالیٰ نے حضور کو اتنی قدرت عطا فرمائی ہے کہ آپ جہاں چاہیں جائیں ——— بعینہٖ یا بمثالہ ——— لیکن ہر حال میں آپ کو اپنی قبر شریف کے ساتھ ایک خصوصی نسبت قائم رہتی ہے دوسری بات یہ ہے کہ جب ایک مومن کی قبر کے متعلق حضورؐ نے فرمایا ہے کہ مومن کی قبر جنت کے ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا ہے تو پھر اس لحاظ سے نبی کی قبر تو جنت کا عمدہ ترین ٹکڑا ہونا چاہیئے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا تعالیٰ نے آپ کی قبر مبارک اور زمین و آسمان اور جنت و عرش کے درمیان سے تمام پردے اُٹھا دئے

---

[1] بحوالہ مسند ابی یعلیٰ عن انس [2] نسائی عن ابن مسعود [3] مدارج النبوۃ ۱۲۰

ہیں اور آپ کو اتنا تصرّف اور نفوذ حاصل ہو گیا ہے کہ آپ بلا انتقال مکانی جہاں چاہیں تشریف لے جائیں۔

یہ بات اس عالم کے لئے ممکن ہے، کیونکہ احوال دُنیا محدود ہیں اور احوال برزخ و آخرت غیر محدود ہیں۔

قبر شریف کے متعلق علاّمہ تاج الدین سبکی فرماتے ہیں:۔

"وہ کونسی جنّت ہے جو حضورؐ کی قبر مُبارک سے افضل ہو گی، آپ کی قبر مُبارک جنّت ہی سے نہیں بلکہ تمام مقاموں سے اعلیٰ وارفع ہے اگر یوں کہا جائے کہ اس قطعہ مُبارکہ کا جو حصّہ حضور کے جسم اقدس سے ملحق ہے وہ عرش سے بھی افضل ہے تو اس میں بھی کسی مومن کو توقف نہیں ہو سکتا۔"[1]

ان دونوں طبقوں کی تشریحات آپ کے سامنے پیش کر دی گئیں، اب اس مسئلہ پر دیوبندی مکتبِ خیال کی وہ تشریح ملاحظہ کیجئے جو متقدمین کے سارے اختلافات کو ختم کر کے تمام صورتوں میں بہترین تطبیق پیدا کرتی ہے ——— نہ نصوص میں کوئی اشکال باقی رہتا ہے اور نہ عقلاً کوئی اُلجھاؤ سامنے آتا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی اپنے ایک مکتوب میں زیارت قبر نبویؐ کے متعلق حافظ ابن تیمیہ کے مسلک کو مرجوح قرار دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

"مدینہ منورہ کی حاضری محض جناب سرورِ کائنات کی زیارت اور آپ کے توسل کی غرض سے ہونی چاہئے۔

آپ کی حیات نہ صرف رُوحانی ہے جو کہ عام مومنین اور شہداء کو حاصل ہے بلکہ جسمانی بھی ہے اور از قبیل حیات دنیوی بلکہ بہت سے وجوہ سے اس سے قوی تر ہے، آپ سے توسل نہ صرف وجود ظاہری کے زمانہ میں کیا جاتا تھا، بلکہ اس برزخی وجود میں بھی کیا جانا چاہئے۔

محبوب حقیقی تک وصال اور اس کی رضا صرف آپ ہی کے ذریعہ اور وسیلہ سے ہو سکتی ہے۔"[2]

حضرت مولانا قاری محمد طیّب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند جو ہمارے اکابر میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے علوم و معارف کے بہترین شارح ہیں، اس مسئلہ پر تحریر فرماتے ہیں:۔

"حضورؐ کی حیات برزخی ہے مگر اس قدر قوی ہے کہ بلحاظ آثار وہ دنیوی بھی ہے یعنی دُنیا میں جب تک حضور تشریف رکھتے تھے حیات ناسوتی بھی تھی مگر اسی آن وہ برزخی بھی تھی اور برزخ ایک درمیانی عالم ہے وہ حیات اُخروی بھی تھی۔ چنانچہ اسی حیات ناسوتی اور اسی جسم اطہر کے ساتھ سماوات اور ارضین طے کرنا عرش تک جا پہنچنا، مسجدِ اقصےٰ میں انبیاء علیہم السلام کی امامت کرنا، ظاہر ہے کہ ترکِ جسد کے ساتھ نہ تھا، پس حیات تو اسی جسدانی عالم کی تھی لیکن جسدِ اطہر خود اتنا لطیف تھا کہ وہ اسی آن عالم برزخ بلکہ عالم غیب کے معاملات اور مشاہدات کی طاقت بھی لئے ہوئے تھا، پس اگر وہی جسدِ اطہر جو دُنیا میں ہمرنگ رُوح تھا بعد وفات اگر عالم برزخ میں پہنچکر بحق دُنیا، اسی طرح زندہ ہے جیسے معراج کے وقت سارے غیبی عالموں میں پہنچکر اپنی جسدانی ہستی کو بحق دُنیا سنبھالے ہوئے رہا اور دنیوی حقوق، اُس کے بدستور قائم ہے تو اس میں تعجب یوں نہیں کہ یہ معاملہ تو اس جسدِ پاک کو بوقتِ معراج پہلے بھی پیش آچکا تھا، فرق اتنا ہوا کہ شبِ معراج میں جسم اطہر کے ساتھ رُوح پرفتوح کا تعلق حسّی طور پر اس طرح قائم تھا کہ اگر ہم ہوتے تو ہم بھی احساس کر سکتے تھے اور بعد وفات، اس طرح حسّی طور پر قائم نہیں رہا کہ ہمیں بھی نظر آئے، سو یہ قصور ہمارا ہوا، نہ کہ تعلق رُوح و جسد کی نوعیت کا، یہی وجہ ہے کہ بعد وفات حضورؐ کے ہونٹوں میں حرکت ہوئی جنازہ میں کلام فرمایا، کہ:۔

"بیرارلیس وما بیرارلیس، سوف تعلمون" اور قبر میں کلام فرمایا جسکو بعض صحابہ نے سُنا، یہ تو وفات کے بعد فوری بات تھی کہ رُوح نے جسم کو کلیۃً نہیں چھوڑا۔ لیکن بعد میں تاحشر بھی رُوح کا وہی تعلق بدن سے قائم رہے گا، جیسا کہ بنص حدیث اجساد انبیاء کا مٹی پر حرام ہونا ثابت ہے۔ اگر اُن ابدان میں کوئی رُوح نہیں ہے تو انھیں گل جانا چاہیے۔ پھر حیات کا یہ اثر عالم برزخ میں ہے، عالم دُنیا میں یہ ہے کہ اُن کے اموال میں میراث جاری نہیں ہوتی، اُن کی ازواج میں بیوگی نہیں آتی، اُن کے نکاح حرام ہوتے ہیں۔ نہ صرف عظمتِ انبیاء کی وجہ سے بلکہ حقیقۃً حیات کی وجہ سے کہ وہ بیوہ ہی نہیں ہیں۔

---

[1] مدارج النبوۃ ص ۲۷۵ ج ۲، [2] مکتوبات شیخ الاسلام ص ۱۳۱ ✶

پس انبیاء کی یہ برزخی حیات جسمانی از قبیل حیات دنیوی بھی ہے کہ اجسام میں حس و حرکت بھی ہے، قبروں میں عبادت بھی ہے، کلام بھی ہے، امت کی طرف توجہ بھی ہے تصرف بھی ہے، بقاء اجسام بھی ہے، اور حیاتِ اجسام بھی ہے، پھر یہی حیات از قبیل حیات برزخی بھی ہے کہ نگاہوں سے اوجھل ہیں، اُن کی آواز ان کانوں میں نہیں آتی، اور کلام ان حسی کانوں میں نہیں پڑتا۔ نیز توجہ الی الامت اور رُخ کا پھیرنا، ان آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ سو اس میں ہماری کمزوری، اور ضعفِ قویٰ کو دخل ہے نہ کہ ان آثار کے موجود نہ ہونے کا، یا قابلِ وجود ہونے کا۔

بالفاظ مختصر دونوں حیاتیں اس طرح جمع ہیں کہ حیات برزخی اصل ہے اور حیات دنیوی اس کے تابع، یعنی وہ عیناً موجود ہے یہ آثار گر موجود ہے، اس طرح دونوں حیاتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ مگر نہ استعارۃً بلکہ حقیقتاً۔

پہلی حیات یعنی دنیوی زندگی میں عین نبوی اس جہاں میں تھا اور تمثل اس جہاں میں، (اور عکس یا تمثال عین شئی ہوتا ہے) اور اس دوسری حیات میں عین نبوی اس جہاں میں ہے اور تمثل اس جہاں میں جیسے وہاں کا تمثل ہر کس و ناکس نہیں دیکھ سکتا، ایسے ہی اب یہاں کا تمثل ہر کس و ناکس نہیں دیکھ سکتا۔ مگر سب جانتے ہیں کہ عکس شئے اور شئی میں عینیت کا علاقہ ہوتا ہے، اگر تباین کا ہو تو مثال یا صورت دیکھ کر کبھی بھی عین کا تعارف نہ ہوا کرے، اس لئے جس جہاں میں جب بھی وجود ہو دوسرا وجود اس کا عین ہے اس لئے حضور اس برزخی جہاں میں رہ کر اگر اس جہاں میں متجلی اور منعکس ہیں تو بعینہٖ ہیں نہ کہ کسی استعارہ یا تشبیہ کے طور پر۔ "واللہ اعلم"

ایک اشکال اور اس کا حل

مسئلہ حیات النبی ؐ پر ایک مشہور اشکال ہے جو حسب ذیل حدیث کی بنا پر پیدا ہو گیا ہو، ضروری ہے کہ بحث کی تکمیل کے لئے اسکی بھی وضاحت کر دی جائے۔

حدیث یہ ہے :۔

ما من احد یسلم علیّ الا رد اللہ علیّ روحی حتی ارد علیہ السلام۔

"جب مجھ پر کوئی سلام بھیجتا ہے، تو خدا تعالےٰ میری رُوح کو میری طرف لوٹا دیتا ہے یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں"

اِس حدیث نے یہ سوال پیدا کر دیا کہ کیا حضور کی رُوح آپ کے جسدِ پاک سے جُدا رہتی ہے اور اس وجہ سے سلام کا جواب دینے کیلئے آپکے تنِ پاک میں اُس کا لوٹانا ضروری ہوتا ہے، پھر اگر یہ بات ہے تو حیات جسمانی کے کیا معنی ؟ ————

اِس اشکال کا جواب ایک تو حضرت شاہ عبد الحق صاحب محدث دہلوی نے دیا ہے، فرماتے ہیں :۔

"سرورِ عالم کی رُوح ہمیشہ مشاہدہ الٰہی میں مستغرق رہتی ہے، جب کوئی مسلمان آپ پر درود بھیجتا ہے تو آپ کی رُوح کو افاقہ دے کر اس عالم کی طرف توجہ کرنے کی فرصت دیدی جاتی ہے تاکہ آپ اُس کا جواب دے سکیں"

حضرت شاہ صاحب کے جواب پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ حضور کو مشاہدہ میں استغراق کا موقعہ ہی نہیں ملتا، کیوں کہ کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا جس میں آپ پر درود و سلام نہ بھیجا جاتا ہو تو پھر آپ کی توجہ کا اس عالم کی طرف ہر آن لگا رہنا ضروری ہوا۔

اِس اشکال کی وضاحت حضرت شیخ الاسلام مولٰنا سیّد حسین احمد صاحب مدنی نے اپنے ایک مکتوب میں اس طرح فرمائی ہے :۔

"اگر لفظ "الی روحی" فرمایا گیا ہوتا تو آپ کا شُبہ وارد ہو سکتا ہے، الی اور علی کے فرق سے آپ نے ذہول فرمایا۔ علی استعلاء کے لئے آتا ہے اور الی نہایت طرف کے لئے،

اِس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ صلوٰۃ و سلام سے پہلے رُوح کا استعلاء نہ تھا، نہ یہ کہ وہ جسم اطہر سے بالکل خارج ہو گئی تھی، اور اب اس کو جسم اطہر کی طرف لوٹایا گیا ہے۔

چونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مدارج قُرب و معرفت میں ہر وقت ترقی پذیر ہیں اِس لئے "توجہ الی اللہ" کا انہماک اور استغراق دوسری

جانب کی توجہ کو کمزور کر دیتا ہے۔ چنانچہ اہلِ استغراق کی حالتیں روزانہ مشاہدہ ہوتی ہیں، مگر جب رسول اللہ صلعم کو رحمۃ اللعالمین بنایا گیا ہے اس لئے بارگاہ الوہیت سے درود بھیجنے والے پر رحمتیں نازل فرمانے کے لئے متعدد مزایا میں ایک مزیت یہ بھی عطا فرمائی گئی، کہ خود سرورِ کائنات کو اس استغراق سے منقطع کر کے درود بھیجنے والے کی طرف متوجہ کر دیا جاتا ہے اور آپ اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کے لئے دعا فرماتے ہیں۔" (مکتوبات شیخ الاسلام ۲۴۳)

جو اشکال حضرت شاہ صاحب کے جواب پر وارد ہوتا ہے وہی اشکال اس جواب پر بھی وارد ہو سکتا ہے۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے زاد المعاد میں اس گتھی کو سلجھایا ہے، لکھتے ہیں:۔

"اس کی گرہ یوں کھلتی ہے کہ وہاں آسمان پر جو موسیٰ علیہ السلام کو آپ نے دیکھا تو وہ انکی روح کا مقام و مستقر تھا اور قبر ان کے جسم کا، جہاں وہ قیامت میں روحوں کے لوٹانے کے وقت تک رہے گا، اسی طرح آپ نے اُن کو ان کی قبر میں نماز پڑھتے بھی دیکھا، جس طرح وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بلند تر مقام یعنی رفیق اعلیٰ میں بھی قرار گیر ہیں اور جسم مبارک قبر شریف میں بھی موجود ہے، جب درود و سلام بھیجنے والا آپ پر سلام بھیجتا ہے تو خدا تعالیٰ آپ کی رُوح کو واپس کرتا ہے تا آنکہ آپ جواب دیتے ہیں، حالانکہ مقام رفیق اعلیٰ سے آپ علیحدہ نہیں ہوئے، جو موٹی طبیعت کا آدمی اس مطلب کو نہ سمجھ سکے اسکو چاہیئے کہ آفتاب کی کہ اس کی دوری اور بلندی کے باوجود اس کا تعلق زمین سے قائم ہے اور اس کے اندر وہ اثر ڈالتا ہے، اور نباتات اور حیوانات کی زندگی میں اس کو دخل ہے۔ پھر رُوح کا مرتبہ تو اس سے بدرجہا زیادہ ہے کیونکہ رُوح کا معاملہ اور ہے اور جسم کا معاملہ اور ہے، دیکھو! آگ اپنی جگہ رہتی ہے اور اس کی گرمی دور کے جسم پر اثر انداز ہوتی ہے رُوح اور بدن کا باہمی تعلق تو اس سے بھی زیادہ قوی اور کامل ہے اس لئے کہ رُوح آگ سے زیادہ اعلیٰ اور لطیف ہے۔"

فقل للعیون الرمد ایاک ان تری ۔ سنا الشمس فاستغشی ظلام اللیالیا

گرد آلود آنکھوں سے کہدو کہ وہ آفتاب کی روشنی کو نہیں دیکھ سکتیں کیونکہ انھیں راتوں کی تاریکی ڈھانپ لیا ہے

(زاد المعاد ۱؍۲ ص ۴۶)

اب وہ جواب ملاحظہ کیجئے جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے اپنی مشہور کتاب "آبِ حیات" میں دیا ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ اُمت کی طرف توجہ فرمانے سے حضور کے استغراق میں قطعاً فرق نہیں پڑتا، فرماتے ہیں:۔

"رُوح پرفتوح نبوی صلعم جب منبع اور اصل ارواح باقیہ خصوصاً ارواح مومنین امت ٹھیری تو جونسا اُمتی آپ پر سلام عرض کرے گا اُس کی طرف کا شعبہ لوٹے گا، ارتداد جملہ شعب لازم نہیں، اور ظاہر ہے کہ اس شعبہ کا ارتداد باعث اطلاع سلام تو ہوگا پر موجب زوالِ استغراق مطلق نہ ہوگا، آخر شعب غیر متناہی اور ہیں۔" (آبِ حیات ص ۲۳۳)

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اس عبارت کی تشریح میرے ایک استفسار پر اپنے مکتوب گرامی میں اس طرح فرماتے ہیں:۔

"آبِ حیات وہ کتاب ہے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے یہ کتاب اُستاد رحمۃ اللہ علیہ سے درساً درساً پڑھی ہے، تب مصنف کے مدارک پر مطلع ہوا ہوں، میں نے حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس واقعہ کا حوالہ دیکر عرض کیا تھا کہ مجھے یہ کتاب آپ پڑھا دیں، تو انہوں نے بایں ذہن و ذکا فرمایا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں، تو ایسی کتاب ہم جیسے نالائقوں کے بس کی بات کیا ہو سکتی ہے اور پھر اس کا بھی ایک ٹکڑا جس کا سیاق و سباق بھی سامنے نہ ہو، اور سامنے کرنے کی فرصت بھی نہ ہو تو جناب خیال فرمائیں کہ ہم جیسوں سے اس میں کیا بن پڑے گا، تاہم ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ایک مستقل نظریہ ہے اور عین مطابق کتاب و سنت ہے کہ اولاً و حقیقتاً مخلوقات میں مومن آپ ہیں، اور آپ کے پرتووں سے دوسرے لوگ اس طرح مومن ہیں جیسے آفتاب بالاصل منور ہے اور در و دیوار اس کے دھوپ پڑ جانے سے منور کہلانے لگتے ہیں۔

پس حقیقتاً در و دیوار منور نہیں ہوتے بلکہ دھوپ اور سورج منور ہوتے ہیں ان کے لگ جانے سے یہ بھی منور کہلانے لگتے ہیں۔ پس اصل میں مومن حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ہیں آپ کے نامزد ہو کر جس کا حاصل انقیاد کلی ہے امتی کو بھی مومن کہا جانے لگتا ہے۔ پس جس طرح

ڈھوپوں کے ٹکڑوں کی اس کے سوا کوئی تعریف اور حد نام کچھ نہیں کہ وہ آفتاب کا ایک اثر ہے۔ اسی طرح مومن کی اس کے سوا کوئی تعریف نہیں کہ وہ پیرو نبوی ہے اور اسکی رُوح وہاں سے کوئی حصہ پائے ہوئے ہو۔

اِس کا قدرتی اثر یہ ہے کہ دھوپ کو آفتاب کا نورانی سایہ کہا جائے جدھر اس کا رُخ ہوگا اُدھر ہی دھوپ کی نقل و حرکت ہوگی، وہ ٹھیر جائے گا یہ بھی ٹھیر جائے گی، وہ لوٹ جائے گا، یہ بھی لوٹ جائے گی۔ اسی طرح مومن بحیثیت مومن حضور کا ایمانی سایہ ہے، جدھر کو آپکے عقیدے و عمل کا رُخ ہوگا اُدھر ہی کو اس کا بھی رخ ہوگا۔ پس مومن کی ایمانی نقل و حرکت تابع ہے حضور کی ایمانی نقل و حرکت، اسی کو ادھر سے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر دھوپ حرکت کر رہی ہے تو یہ دلیل ہوگی کہ آفتاب ضرور حرکت میں ہے، گویا پہلے وہ حرکت میں آیا تب یہ حرکت میں آئی۔ گویا آفتاب متوجہ ہوا تو دھوپ میں نقل و حرکت پیدا ہوگئی۔ لیکن اس خاص قطعہ دھوپ کی طرف آفتاب کے توجہ کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اب وہ دوسری دھوپوں کی طرف متوجہ نہیں رہا ہمہ تن اسی دھوپ کا ہوگیا، بلکہ اسے بھی حرکت میں لا رہا ہے اور دوسرے قطعہ ہائے دھوپ بھی اپنی اپنی جگہ اپنے ظرف میں اس کی حرکت سے متحرک ہیں۔ پس بظاہر تو دھوپ آفتاب کی طرف متوجہ ہے اور بحقیقت آفتاب دھوپ کی طرف متوجہ ہے۔ اسی طرح بظاہر تو اُمتی درود و سلام پڑھ کر حضور کی طرف متوجہ ہے مگر بحقیقت پہلی توجہ حضور کی ہے جس سے اس کے قلب کا رُخ حضور کی طرف ہوگیا ہو اور جیسے آفتاب ایک قطعہ کی طرف توجہ کرکے ہمہ تن اس ایک قطعہ میں مستغرق نہیں ہو جاتا ایسے ہی حضور بھی کسی ایک دو، دس بیس اُمتیوں کی طرف یہ توجہ خاص فرما کر دوسرے اُمتیوں سے بے رُخ نہیں ہوتے، اور استغراق کلی فرد واحد کی طرف نہیں ہوتا جسکو دوسرے افراد سے زوالِ استغراق سے تعبیر کیا جائے، کیونکہ شعب بے انتہا ہیں جن کی طرف توجہ ہے۔ اسی سے یہ واضح ہوا کہ اگر استغراق ہو سکتا ہے تو پوری اُمت کی طرف ہو سکتا ہے نہ کہ ابعاض کی طرف، لہذا استغراق بھی ثابت مگر لجمیع الامۃ اور عدم استغراق بھی مگر للابعاض الامت۔

پھر یہ بھی یہیں سے واضح ہو جاتا ہے کہ آفتاب اگر ساری دھوپوں طرف متوجہ ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے نفس اور مالک النور کی طرف متوجہ نہیں، اگر اس کا رُخ خود اس کی ہی اصل کی طرف نہ ہو تو یہ نور ہی اس میں کہاں سے آئے؟ اس لئے وہ اپنے اصل منبع النور یعنی ذات خداوندی کی طرف بلاشبہ رُخ کئے ہوئے ہے، اس منبع النور کی طرف سے اس کا رُخ دھوپوں کی طرف کل کی طرف اور بعض کی طرف کردیا ہے کہ تکوینا وہ اوپر سے نور لیتا ہے اور نیچے کو دیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح حضور پُرنور اگر تمام اُمت یا ابعاض امت کی طرف متوجہ ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ اپنے نفس کریمہ اور اپنے اصل حقیقی یعنی رب العزت کی طرف متوجہ ہیں۔ نہیں بلکہ اُدھر متوجہ ہو کر نور لیتے ہیں، حاصل شدہ نور کا ذخیرہ اپنے نفس کریمہ میں جمع فرماتے ہیں اور پھر اس مخزنِ نور سے توجہ اُمت کی طرف فرماتے ہیں تو اُمتی بھی بطور ردِ عمل حضور کی طرف متوجہ ہو کر جس کی صورت صلوٰۃ و سلام ہے نور حاصل کرتے ہیں۔ اسی بجانب الشرع کا اپنے نفس کریمہ کی طرف پھیرنا۔ رد اللہ علی روحی سے تعبیر فرمایا گیا ہے، اور پھر نفس کریمہ کو امتی کی طرف متوجہ کرنے کو حتی اسلم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پس ردِ روح کا مطلب نفخ روح نہیں بلکہ اقبال و توجہ ہے، اسلئے یہ حدیث درحقیقت شرح ہے اس نظریہ کی جو آبِ حیات کی عبارت میں مرقوم ہے، اور اس عبارتِ قاسم العلوم کی شرح اپنے فکر ناقص سے وہ ہے جو عرض کی گئی۔" واللہ اعلم +

حاصل یہ ہوا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہر آن مشاہدہ جمالِ الٰہی میں بھی مستغرق رہتے ہیں اور اُمت کی طرف بھی آپکی توجہ ہر لحظہ مبذول رہتی ہے، نہ یہ "استغراق توجہ" میں مانع ہوتا ہے نہ "توجہ استغراق" میں، یہی وجہ ہے کہ جب امت کا ایک عارفِ کامل حالت کشف میں اپنے محبوب کے جمالِ جہاں آرا کے دیدار سے مشرف ہوا تو اس نے سرورِ عالم کو اس حال میں پایا:۔

"ورأيته مستقراً على حالة واحدة	"میں نے سرورِ عالم کو اس حال میں دیکھا کہ آپ
متوجهاً الى الخلق لابساً لباس العظمة	بندگانِ الٰہی کی طرف متوجہ تھے، بڑی توجہ کیساتھ
فاذا توجه اليه انسان بجهد همته	عظمت و بڑائی کا لباس آپکے زیبِ تن تھا۔
ولا اريد الانسان العالي الهمة فقط	جب کوئی خدا کا بندہ ذوق و شوق کے ساتھ
بل كل ذي كبد يشتاق الى شيئ و	آپکی طرف متوجہ ہوا تو میں نے دیکھا کہ سرورِ عالم
يتوجه اليه بقصده وشوقه فانه	اس سے قریب ہوگئے اور میں نے دیکھا کہ جس شخص نے
يتدلى اليه ورأيته صلى اللہ علیہ وسلم	حضور پر درود و سلام بھیجا اور آپکی تعریف کی
ينشرح انشراحاً عظيماً لمن يصلي عليه وحمد"	تو آپ اس سے بہت زیادہ خوش ہوئے"

حضرت مولانا احمد حسن صاحب محدث امروہی رح

(مولانا نسیم احمد فریدی مدرس مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ)

”صاحبزادہ مولوی سید محمد ازہر شاہ قیصر نے اب سے کئی ماہ پیشتر مجھ سے حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح پر ایک مقالہ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ میں نے فرمائش کی تعمیل کا وعدہ کرلیا تھا۔ کئی ماہ یہ کام ٹلتا رہا، بالآخر وقت نکال کر اس وعدہ کی تکمیل کر رہا ہوں“۔

(نسیم احمد فریدی)

حضرت محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ۔ قاسم العلوم والمعارف حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نور اللہ مرقدہ کے ممتاز اور محبوب شاگرد تھے۔ خدا کے فضل و انعام سے باکمال استاذ کی شفقت و توجہ اور پیدائشی و فطری صلاحیت کی مدد سے وہ مجسّم تصویر قاسم بن گئے تھے۔

یوں تو حضرت قاسم العلوم والمعارف رح کے شاگردوں کی تعداد بہت کچھ ہوگی۔ لیکن یہ تین شاگرد بہت ہی مشہور ہوئے، اتنے مشہور کہ جہاں حضرت نانوتوی رح کا نام نامی آتا ہے ان تینوں کا نام بھی آجاتا ہے

(۱) شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب محدث دیوبندی رح۔

(۲) سید العلماء حضرت مولانا سید احمد حسن صاحب محدث امروہی رح

(۳) فخر العلماء حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی رح

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رح نے ”سوانح قاسمی“ میں، مولوی رحمان علی رح نے ”تذکرۂ علماء ہند“ میں، مولوی عبد الرحمن صاحب امرتسری رح (مؤلف کتاب الصرف وکتاب النحو) نے اپنے ”سفر نامہ بلاد ہند“ میں، نیز بعض دیگر تذکرہ نویسوں نے حضرت مولانا نانوتوی رح کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی ان تینوں شاگردوں کا ذکر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ کے ضمن میں کیا ہے۔

ان میں سے اول الذکر دو حضرات نے دیوبند اور امروہہ میں اپنے استاذ معظم کے معارف، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح کی حکمت اور حضرت شاہ امداد اللہ چشتی رح کے سلوک کی اشاعت کی۔ حدیث، تفسیر، فقہ اور جملہ علوم و فنون کے درس دئے اور تشنگانِ علوم کی ایک بڑی جماعت کو سیراب کیا۔ بلا مبالغہ بغیر خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ ان دونوں ہستیوں نے اپنے رفقاء و متوسلین کی نصرت سے ہند اور بیرونِ ہند میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح کا تعلیمی نظام، اور تبلیغی پروگرام زندہ و برقرار رکھا۔ اور ان کی جد و جہد کے اثرات آج تک باقی ہیں۔

ان دونوں نے اپنی تمام عمر درسی مشاغل میں صرف کی، تادمِ آخر تعلیمات اسلامیہ کے رائج کرنے میں منہمک رہے۔ اور نازک اوقات میں ملتِ بیضا کی پوری پوری حمایت و حفاظت کی۔

مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی کے کارناموں کا احقر کو پورا علم نہیں ہے، اتنا معلوم ہے کہ وہ مدرسہ عبد الرب دہلی میں کچھ عرصے مدرس رہے، ابوداؤد شریف پر حاشیہ لکھا تھا۔ اپنے استاد کی بعض تصانیف کو مرتب کر کے شائع کرایا اور ان کی ایک مبسوط و مکمل سوانح عمری لکھی تھی، جس کا آج پتہ نہیں کہ کیا ہوئی۔

کیا اچھا ہو کہ کوئی صاحب جو مولانا فخر الحسن صاحب رح کی سوانح سے واقفیت رکھتے ہوں ان کے سوانح پر بھی ایک مقالہ سپرد قلم کردیں۔

میرے خیال میں ان تینوں حضرات کی زندگیاں حضرت مولانا نانوتوی رح کی حیات طیبہ کا تتمہ ہیں۔

حضرت شیخ الہند رح کے حالات شیخ الاسلام مرشدنا حضرت مولانا مدنی مدظلہ، نے ”سفر نامہ اسیر مالٹا“ میں۔ حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب دیوبندی رح نے ”حیات شیخ الہند“ میں۔ اور حکیم الامت حضرت

مولٰنا تھانویؒ نے "ذکرِ محمود" میں جمع کر دیئے ہیں۔ لیکن حضرت مولٰنا امروہیؒ کے حالات کتابی صورت میں آج تک مرتّب نہ ہو سکے۔

اگرچہ حضرت محدث امروہیؒ کی قائم کردہ عظیم الشان درسگاہ موجود ہے، اُن کے بہت سے تلامذہ آج بھی امروہہ، ہند اور بیرونِ ہند میں بقیدِ حیات ہیں، اُن کے اکلوتے صاحبزادے مولٰنا قاری سیّد محمد صاحب مدظلہٗ موجود ہیں لیکن زمانہ جتنا گذرتا جا رہا ہے حالات کے مرتّب ہونے میں دشواری ہوتی جا رہی ہے۔ حضرت مولانا حافظ عبدالرحمٰن صدیقی امروہیؒ۔ حضرت مولٰنا عبدالغنی صاحب پھلاودیؒ اور دیگر اکابر جو زیادہ حالات سے واقف تھے وہ اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ مولٰنا امروہیؒ کے خاندان اور شہر امروہہ کے معمّر اشخاص آج موجود نہیں۔ اگر چالیس سال پیشتر مولٰنا رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری کو مرتب کر لیا جاتا تو پوری زندگی کے حالات تفصیلاً معلوم ہو جاتے، اور اُن کے تمام علمی مذہبی کارنامے پوری صحت و تحقیق کے ساتھ من و عن سامنے آ جاتے۔

مولوی محمود احمد صاحب عباسی نے "تذکرۃ الکرام" کے اندر مشاہیر امروہہ کے سلسلہ میں حضرت محدّث امروہی کا بھی تذکرہ لکھا ہے لیکن مفصّل حالات لکھنے کی نہ تو اس کتاب میں گنجائش تھی اور نہ تفصیلی حالات اُن کو معلوم ہو سکے ہوں گے۔

آج مولٰناؒ کی وفات کو تقریباً تینتالیس[۴۳] سال کا عرصہ گذر چکا ہے، میں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا بھی نہیں شاید میں اُن کے وصال کے وقت ایک سال کا ہوں گا۔ اِس صورت میں احتیاط کے ساتھ ایک مقالہ لکھنے میں بھی مجھے کافی تلاش و جستجو کرنی پڑی۔

میں عقیدت مندی کے تحت مبالغہ آرائی کے ساتھ سنی سُنائی باتوں کے لکھنے کا عادی نہیں ہوں۔ جو کچھ لکھا ہے حتی الامکان تحقیق کر کے لکھا ہے۔

اِس وقت میری معلومات کے ذرائع وہ چند ہستیاں ہیں جنہوں نے حضرتؒ سے اخذِ فیض کیا ہے، اُن کی تقریریں سُنی ہیں یا اپنے ہوش کے زمانے میں اُن کو دیکھا ہے۔

شاہ سلیمان احمد صاحب چشتی۔ مولٰنا محمد اسمٰعیل صاحب انصاری۔ مولٰنا قمر الدین صاحب سہنسپوری۔ حکیم محمد رفیع خاں صاحب لودھی قاری عزیز الحق صاحب عباسی۔ اور حکیم سیّد حسن مثنیٰ صاحب رضوی مرحوم سے مجھے اس سلسلے میں کافی مدد ملی۔

اِن بزرگوں سے سُنی ہوئی محقق باتوں کے علاوہ بعض یادداشتیں، رسالہ جات "القاسم" کے چند اقتباسات، "تذکرۃ الکرام" کے چند جُملے، حضرت مولٰنا امروہیؒ کی دستی سندیں اور اُن کے غیر مطبوعہ چند فتاوے، تقریرِ ترمذی کے کچھ اوراق، افادات احمدیہ، اور کتب خانہ پھلاودہ سے حاصل شدہ معلومات اور بعض دیگر تحریرات اس مقالہ کے اجزاء ترکیبی ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں جو واقعات اپنے اُستاذ حضرت مولٰنا سید رضا حسن صاحب مرحوم داماد و برادر زادہ حضرت امروہیؒ اور دوسرے اُستاذ حضرت مولٰنا انوار الحق صاحب عباسی مرحوم سے سُنتے ہوئے یاد ہیں، وہ بھی اس مقالے میں حسب موقع کہیں کہیں شامل کروں گا۔ یوں تو کثرت سے حضرت مولٰناؒ کی حکایات و واقعات اہل امروہہ کی زبانوں پر ہیں۔ لیکن اُن کا بغیر تنقید درج کرنا مناسب نہ جانا!

حضرت محدث امروہیؒ کے صاحبزادے مولٰنا قاری سید محمد صاحب عرف بنّے میاں کے پاس رکھا ہوا قلمی ذخیرہ بھی دیکھنے کو ملجاتا تو شاید اس سے زائد لکھ سکتا مگر حضرتؒ کے صاحبزادے حیدرآباد دکن ہیں اس لئے اُس ذخیرہ سے مستفیض نہ ہو سکا۔

عرصے سے میری تمنّا ہے کہ کسی نہ کسی طرح مولٰنا کے مکمل حالات کتابی صورت میں آ جائیں اور اُن کی تحریرات و قلمی مسودات اُن کی تقاریر و فتاویٰ شائع ہو جائیں مگر ابھی تک میری یہ تمنّا پوری نہ ہو سکی۔

اُن کے اُستاذ مرحوم و مغفور کی سوانح عمری مولٰنا گیلانی کے قلم سے پچھتر سال کے بعد مرتب ہوئی ہے اگر اُن کے مکمل سوانح حیات کچھ عرصے معرض تاخیر میں رہ کر مرتب ہوں تو کیا تعجب ہے۔ خیر یہ مقالہ پیش کر رہا ہوں، خدا کرے کسی قابل ہو جائے اور ایک کامل و مکمل شخصیت کی زندگی کا کچھ نہ کچھ اندازہ اس کے ذریعہ ناظرینِ "دارالعلوم" لگا سکیں۔!

خاندان اور ابتدائی حالات

نسباً آپ کا تعلق ساداتِ حسینیہ سے تھا، امروہہ کے مشہور بزرگ حضرت شاہ ابنؒ[۱] صاحب قدس سرہٗ کی اولاد میں سے تھے۔

---

[۱] یہ بزرگ اکبری دور کے مشائخ میں سے تھے ۹۸۷ھ میں [illegible]

سیّد اکبر حسین صاحب آپ کے والد ماجد کا اسم مُبارک تھا۔ ۱۲۶۷ھ میں پیدا ہوئے۔

صاحب تذکرۃ الکرام نے آپ کے تذکرہ کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے:

"علامۂ زمان، افتخار زمانیان، اُستاذ الاساتذہ، افضل الفضلاء، امام المحدثین، ذہین، فطین، خوشرد، خوش خو، خوش تقریر، صاحب وجاہت و بزرگ عہد تھے۔ شاہ ابو القاسم بن حضرت شاہ ابن بدر چشتی رح کے پوتے، میر اکبر حسین کے بیٹے ۱۲۶۷ھ میں ولادت ہوئی"۔

وطن میں کس کس سے تعلیم پائی

آپ نے ابتدائی و متوسط عربی اور فارسی تعلیم امروہہ کے بلند پایہ علماء مولانا سید رافت علی صاحب رح، مولانا کریم بخش صاحب بخشی رح اور مولانا محمد حسین صاحب جعفری رح سے حاصل کی۔ طب کی تعلیم امروہہ کے مشہور طبیب حکیم امجد علی خاں اثنا عشری سے پائی۔

حضرت قاسم العلوم رح سے اخذ فیض

نانوتہ۔ میرٹھ اور دیوبند میں رہ کر حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رح سے تمام علوم و فنون کی تکمیل کر کے فارغ التحصیل ہوئے۔ اور اپنے اُستاذ کے کمالات علمیہ کا مکمل آئینہ بن کر مسند درس پر جلوہ آرائی فرمائی۔

شفیق اُستاد نے اپنے اس ہونہار شاگرد کو جس طرح شفقت، عزت اور توجہ کے ساتھ سفر و حضر میں پڑھایا، اولاد سے زیادہ عزیز رکھا، اس کی نظیر اُس زمانے کی تاریخ میں بہت کم ملے گی۔ حضرت نانوتوی رح نے اپنے

لے شیعوں سے مناظرہ میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ رد شیعہ میں کئی معرکۃ الآراء کتابیں لکھیں جن میں سے اکثر شائع ہو گئی ہیں۔ ۲؎ مولانا قاری امام الدین بخشی امروہی خلیفہ شاہ غلام علی دہلوی و اُستاذ قاری عبد الرحمٰن صاحب پانی پتی رح کے صاحبزادے تھے۔ قاری صاحب پانی پتی رح نے تجوید کا مشہور رسالہ "تبیین الضاد" اپنے اُستاذ زادے مولانا کریم بخش رح کی فرمائش پر لکھا ہے جیسا کہ اُس کے دیباچہ سے ظاہر ہے۔ ۱۲

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶) ملا عبد القادر بدایونی رح، شیخ عبد الحق محدث دہلوی رح، سید کمال سنبھلی رح مؤلف استراریہ، علامہ آزاد بلگرامی رح اور دیگر مؤرخین نے مفصلاً و مجملاً، مستقلاً و ضمناً ان کا ذکر اپنی اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ ۱۲

(نسیم احمد)

باکمال تلمیذ کو فارغ ہوتے ہی تعلیمی تحریک کا رکن بنا دیا۔ اور ملت بیضاء کی سرسبزی و شادابی کے لئے خود جو جد و جہد کر رہے تھے اُسی جد و جہد میں ان کو بھی مشغول و منہمک کر دیا۔

شاگرد کو ہمیشہ "میر صاحب" میر صاحب کہہ کر پکارتے۔ اہم علمی اشکالات کو اُن کی خاطر حل کرتے۔ اپنے عزیز شاگرد کی خاطر سے کئی مرتبہ امروہہ تشریف لائے اور اپنے قدوم میمنت لزوم سے اس تاریخی بستی کو مشرف فرمایا۔ ایک مرتبہ مدرسہ اسلامیہ کے قیام کا اہل امروہہ کو مشورہ دیا۔ حضرت قاسم العلوم کی چشم کرم کا صدقہ ہے کہ امروہہ کی سرزمین پر دینی و مذہبی درس گاہ کا وجود عمل میں آیا۔

مولٰنا نانوتوی رح کے علاوہ دیگر اساتذہ:

حضرت نانوتوی رح کے علاوہ آپ کے اساتذہ میں (جن سے صرف اجازتِ حدیث ہے) مولانا احمد علی سہارنپوری رح قاری عبد الرحمٰن پانی پتی رح اور مولانا عبد القیوم نزیل بھوپال بھی شامل ہیں۔ حج بیت اللہ کے لئے حجاز تشریف لے گئے تو وہاں اُستاذ الاُستاذ حضرت مولانا شاہ عبد الغنی صاحب مجددی مہاجر مدنی رح سے حدیث کی سند حاصل کی۔

بیعت

شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ فاروقی مہاجر مکی رح سے بیعت اور اُن کے خلیفہ تھے۔

کہاں کہاں درس دیا

فارغ التحصیل ہونے کے بعد اوّلاً خورجہ میں درس علوم دیا۔ اُس وقت آپ نوجوان تھے سبزہ آغاز تھا۔ میں نے مولانا عبد الرحمٰن صاحب خورجوی مرحوم سے[۳] براہ راست یہ واقعہ سُنا ہے کہ اُن کی دادی نے مولانا امروہی رح کی آمد سے پہلے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ "ہمارا یہ لڑکا تمہارے یہاں آئے گا اس کا خیال رکھنا"۔ اُن نیک نہاد خاتون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ "یہ صاحبزادے حضرت حسن رض کی اولاد میں ہیں یا حضرت حسین رض کی؟"۔ فرمایا کہ "حسین کی اولاد سے ہیں"۔ اُس کے بعد جب حضرت امروہی رح خورجہ تشریف لائے۔ مولانا خورجوی رح

۳؎ پہلے یہ واقعہ حضرت مولانا سید رضا حسن صاحب امروہی رح سے سُنا تھا بعدہٗ خورجہ جانا ہوا تو براہ راست مولانا خورجوی رح کی زبانی سُنا۔

کی دادی نے مولانا کی دعوت کی۔ مولانا اُن کے مکان پر تشریف لیگئے اُن خوش بخت سماۃ نے پردہ میں سے کسی ضرورت کے لئے باہر نظر ڈالی، تو وہی شکل مبارک آنکھوں کے سامنے تھی جو خواب میں دکھلائی گئی تھی۔

خورجہ میں اُس مدرسہ میں صدر مدرس رہے جسکو حضرت مولانا قاسم العلوم رح نے قایم فرمایا تھا۔ کس سن میں خورجہ گئے اور کب تک وہاں رہے یہ نہ معلوم ہوسکا۔

خورجہ کے بعد سنبھل و دہلی کے مدارس میں مختلف اوقات میں بعہدۂ صدر مدرسی فائز ہوئے۔ یہ نہ معلوم ہوسکا کہ ان دونوں مقامات میں سے پہلے کہاں درس دیا۔ اور ہر مقام پر کتنے کتنے عرصے اور کس کس سن میں رہے۔ مدرسۂ دہلی (امیر الروایات سے معلوم ہوا کہ یہ مدرسہ عبد الرب تھا) میں مولنا خلیل الرحمٰن امروہی رح کو جو قلم خاص سے لکھی ہوئی سند عطا فرمائی ہے (جو احقر کے پاس محفوظ ہے) اُس میں اپنے دستخط اِس عبارت کے ساتھ ثبت کئے ہیں:-

"کتبہٗ وحررہٗ احقر الزمن احمد حسن حُسینی عفی عنہٗ
فی المدرسۃ العربیۃ الواقعۃ فی الدھلی"

اِس سند میں تاریخ و سن درج نہیں، جس سے پتہ چلتا کہ کس زمانے میں دہلی میں بسلسلۂ مدرسی قیام رہا۔ البتہ "امیر الروایات" سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ حضرت قاسم العلوم رح بھی منشی ممتاز علی مرحوم کے مطبع میں کام کرنے کے سلسلہ میں دھلی میں مقیم تھے۔ خود مولنا نانوتوی رح نے اس سند کے آخر میں فارسی میں حسب ذیل الفاظ لکھ کر دستخط فرمائے ہیں، اور اجازت مرحمت فرمائی ہے:-

"بندۂ کمترین محمد قاسم ہم می گوید کہ مولوے
خلیل الرحمٰن از من چند سبق صحیح مسلم شریف خواندہ
انداز سیماء حالِ او شان صلاح عیان است بشرط
مرقوم بالا کہ جناب مولوی احمد حسن صاحب مدظلہٗ
رقم فرمودہ اند من ہم اجازت درس حدیث و تفسیر میدہم
خداوند کریم مبارک فرماید و در علم شان برکت دہد آمین
ثم آمین! یارب العلمین"
محمد قاسم عفی عنہٗ
العبد

ملاحظہ فرمائیے کہ کس محبت و اکرام کے ساتھ حضرت قاسم العلوم والمعارف رح اپنے عزیز شاگرد کے نام کے شروع میں جناب، اور آخر میں مدظلہٗ، اِرقام فرمارہے ہیں۔

مدرسہ شاہی مراد آباد سے تعلق

مدرسۃ الغربا، مراد آباد جسکو مدرسہ شاہی کے نام سے شہرت حاصل ہے، حضرت قاسم العلوم نانوتوی رح کی وفات سے ایک سال پیشتر ماہ صفر ۱۲۹۶ھ میں حضرت نانوتوی رح کے ایماء اور مشورہ سے قایم ہوا، اُس کے پہلے صدر مدرس حضرت محدث امروہی رح مقرر کئے گئے۔ رمضان ۱۳۰۳ھ تک حضرت امروہی رح کا اس مدرسہ سے تعلق رہا۔ اس سات سال کے عرصہ میں بہت سے طلبائے علوم نبویہ کامیاب اور فارغ التحصیل ہوئے جن میں سے چند اکابر و مشاہیر او صاحبان درس حضرات کے اسماء یہ ہیں:-

۱- سراج المفسرین حضرت مولنا حافظ عبد الرحمٰن صاحب صدیقی امروہی رح۔ محشیٔ بیضاوی۔
۲- قطب الوقت مولنا حافظ عبد الغنی صاحب پھلاودی رح
۳- مولنا محمد یحیٰی صاحب شاہجہان پوری رح (مرتب افادات احمدیہ قلمی)
۴- مولنا محمود حسن صاحب سہسوانی رح۔
۵- مولنا عبد الحق صاحب پیلی بھیتی رح
۶- قاضی عبد الباری گڑھ مکٹیسری رح
۷- مولنا خادم حسین صاحب امروہی رح

اِن حضرات میں سے حضرت مولنا حافظ عبد الرحمٰن صاحب امروہی رح کی سند کو جو ۱۳۰۱ھ میں انہیں ملی تھی، احقر نے خود مطالعہ کیا ہے حضرت محدث امروہی رح ۱۳۰۳ھ میں مدرسہ شاہی مراد آباد سے مستعفی ہوگئے تھے۔ اُن کے بعد مختلف اوقات میں علاوہ حضرت مولنا عبد العلی صاحب قاسمی رح کے متعدد صدر مدرس ہوئے جن میں سے حضرت مولنا حافظ عبد الرحمٰن صاحب امروہی رح اور حضرت

مولانا محمود حسن صاحب سہسوانی رح براہ راست حضرت امروہی رح کے تلامذہ میں تھے۔ (ماخوذ از رُوداد قدیم مدرسہ شاہی)

خورجہ، دہلی اور مُراد آباد سے متعلق امیر الروایات کی حکایات

(۱) مولوی امیر شاہ خاں صاحب مرحوم ایک طویل واقعہ کی حکایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

”اب پھر قصہ سُنو۔ مولوی احمد حسن صاحب امروہی اُس زمانے میں خورجہ میں مدرس تھے مولانا نانوتوی بھی خورجہ میں تشریف لے آئے مولوی عبدالرحمن صاحب موجہ والوں کے مکان پر قیام فرمایا۔“

(امیر الروایات ص ۴۲ مطبوعہ محبوب المطابع دہلی)

(۲) ”ایک مرتبہ مولانا محمد قاسم صاحب خورجہ تشریف لائے اور مولوی عبدالرحمن خاں خورجوی کے مکان پر ٹھیرے۔ سردی کا موسم تھا اور چھت کے اوپر چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور مولانا دھوپ میں ٹوپی اُتارے ہوئے ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے اور مولوی احمد حسن صاحب مولانا کی پائینتی بیٹھے ہوئے تھے الخ“

(امیر الروایات ص ۹۶)

(۳) خانصاحب نے فرمایا کہ ”مدرسہ عبدالرب“ پہلے امام کی گلی کی طرف تھا اور اُس میں مولوی احمد حسن صاحب امروہی و مولوی فخر الحسن صاحب گنگوہی مدرس تھے مولانا محمد قاسم صاحب اُس زمانہ میں منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں کام کرتے تھے۔ مولوی احمد حسن اور مولوی فخر الحسن صاحبان کی وجہ سے اکثر مسجد میں سویا کرتے تھے الخ“

(امیر الروایات ص ۲۵)

(۴) جناب خانصاحب نے فرمایا کہ مولوی احمد حسن صاحب امروہی مُراد آباد کے مدرسہ شاہی میں مدرس تھے۔ مولانا نانوتوی کے انتقال کے بعد مولوی محمد یعقوب صاحب ہر سال جا کر امتحان لیا کرتے تھے“ الخ

(امیر الروایات ص ۷)

(باقی آئندہ)

احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن!

(حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی)

اب حسب وعدہ آخر میں اپنے اُن چند دلچسپ اسفار کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، جو قیام دارالعلوم کے زمانہ میں پیش آئے۔

واقعہ یہ ہے کہ طالب العلمی کے دنوں میں بھی جب کبھی موقعہ ملتا اپنے خاص حالات کے تحت فقیر مدرسہ سے باہر نکل جایا کرتا تھا۔

خوب یاد ہے عیدالاضحیٰ کی تعطیل مدرسہ میں ہوئی۔ اچانک خیال آیا اس تعطیل سے نفع اُٹھانا چاہئے، کلیر شریف آستانہ صابری کی زیارت کے لئے روانہ ہوا۔ رڑکی کا اسٹیشن سے اُتر کر گنگ نہر کی بغل میں ہوتے ہوئے نہر کے کنارے کنارے، بہتے ہوئے صاف و شفاف پانی کی دید سے لذت اندوز ہوتے پیران کلیر شریف پہونچ گیا، لوگوں سے سُن تو چکا تھا کہ "روضۂ صابریہ" آبادی سے باہر جنگل میں ہے۔ لیکن "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" کلیر کی آبادی نہر کے اس پار غالباً بجانب شمال واقع تھی، اور نہر کے جنوبی ساحل پر عمارتوں کا طویل و عریض سلسلہ حضرت والا کے روضہ کے اردگرد پھیلا ہوا تھا۔ مگر روضۂ طیبہ کے سوا جہاں تک میرا خیال ہے، کوئی دوسری آبادی آس پاس نہ تھی۔ اسی روضہ میں داخل ہوگیا۔ روضے پر پہونچ کر حسب دستور فاتحہ خواں ہوا۔ مسجد پہونچا، قرآن کی تلاوت میں مشغول تھا، رُخ میرا قبلہ کی طرف تھا۔ دیکھا کہ پیچھے سے کوئی صاحب آئے اور ڈانٹ رہے ہیں کہ "تیری پشت روضۂ مبارک کی طرف ہے" اس کا بھی تجھے خیال نہیں"۔ میں نے عرض کیا کہ "بھائی! مسجد میں بیٹھنے کی طبعی صورت یہی ہو سکتی تھی جس طرح میں بیٹھا ہوا ہوں"۔ پھر میں نے کہا کہ آپ تو صوفی ہیں، صوفیوں کا تو مشہور نظریہ ہے، کہ

"ہر جا کہ نظر کردم سیمائے تو می بینم"

اور ظاہر ہے کہ بزرگوں کی ساری بزرگیاں اسی ذات بزرگ و برتر کی بزرگی کے ساتھ وابستہ ہے، جو ہر جگہ ہر شخص کے ساتھ ہے، پھر تو نہ بیٹھنے ہی کی کوئی شکل باقی رہتی ہے، اور نہ لیٹنے کی۔ سمجھ گئے کہ کوئی وہابی المزاج آدمی ہے، بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے، اس کا خیال بھی نہ تھا کہ اس ویرانے میں کھانے دانے کا نظم ممکن ہوگا، سوچ رہا تھا، کہ گرسنگی کا تقاضا جب ناقابل برداشت حد تک پہونچ جائے گا، تو نہر کے پار جس پر پل تھا آبادی میں کسی بھٹیارے و بنیارے کی دکان کو جھانکوں گا۔ لیکن ابھی تقاضے کا آغاز ہی ہوا تھا کہ دیکھا ایک صاحب آرہے ہیں۔ چند چپاتیاں اور مسور کی دال پیالہ میں لے کر پہونچے، اور بولے "جب تک تیرا قیام یہاں رہے گا، یہ خوراک تجھ تک پہنچتی رہے گی" کھانا لے لیا گیا، اور ان ہی کے سامنے جہاں اس کو پہونچانا تھا، پہونچا دیا گیا۔ وہی صاحب شاید کہیں سے پانی بھی لے آئے۔ ٹھنڈا خوشگوار تھا۔ شکر کے ساتھ خورونوش کے اس فرض کو ادا کر کے اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔

قیام کی مدت کتنی تھی، اب یاد نہ رہی۔ لیکن صبح کی نماز کے لئے نہر کے کنارے وضو کرنے کا پُرکیف منظر بھلایا نہیں جا سکتا۔ جب تک قیام رہا۔ وہی چند چپاتیاں اور مسور کی دال والا راشن مجھ تک پہنچتا رہا بظاہر خانقاہ میں شاید وارد صادر لوگوں کے لئے اس کا انتظام تھا، اب ہے یا نہیں، لیکن اُس وقت میری سمجھ میں یہی آیا تھا خانقاہ کے مختلف حجروں میں کچھ لوگ جو باہر سے آئے ہوئے تھے، ان پر بھی نظر پڑتی تھی، لیکن ظاہر ہے کہ میرا تو مذہب ان لوگوں کے میل جول سے مانع تھا حتیٰ کہ اس کی تلاش بھی پیدا نہ ہوئی کہ یہاں کے سجادہ صاحب یا خانقاہ کے ناظم صاحب کون ہیں؟ اپنا رشتہ تو صاحب مزار سے تھا۔ جہاں تک ممکن تھا قرآن مجید کی تلاوت کا ثواب حضرت والا کی

روح پاک کو پہونچاتا رہا۔ تا آنکہ عید کا دن اسی مسافرت کی حالت میں آگیا شاید کرتہ، پائجامہ کا ایک جوڑا اپنی گٹھری میں تھا عید کے لئے نکال لیا اور اسی میدانی علاقے میں خانقاہ کے احاطہ ہی میں غالباً نماز اور خطبہ ہوا۔ شریک ہوا۔ اُس وقت دور سے سجادہ صاحب پر نظر پڑی۔ کسی نے کہا کہ یہی سجادہ صاحب ہیں، کافی معمر آدمی تھے۔ نماز کے بعد دیکھا کہ وہی سجادہ صاحب جو عبا، جبّہ اور عمامہ زیب تن کئے ہوئے تھے۔ صورت سے ایک ثقہ اچھے پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ لیکن یہ دیکھ کر میری روح کانپ گئی، سنسنی سی کیفیت سارے جسم پر طاری تھی جب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ نماز سے فارغ ہو کر بایں ریش و فش، عبا و عمامہ روضہ کے سامنے وہی پہونچے اور اُن کی وہی پیشانی جو ابھی کچھ دیر پہلے آسمان و زمین کے خالق کے سامنے سے اُٹھی تھی، اللہ اللہ کتنا ایمان سوز نظارہ تھا، کہ اسی پیشانی کو انہوں نے روضۂ پاک کے سامنے رکھتے ہوئے اپنی ان ساتوں ہڈیوں کو جن پر نمازوں میں سجدہ کیا جا رہا ہے، وہ سر بسجود تھے۔

ساری عمر جن بزرگوں کی صرف اسی جدوجہد میں گذری کہ آدمؑ کی اولاد کے ماتھوں کو مخلوقات کے سامنے سے ہٹا کر براہ راست خالق کائنات کے آگے ڈال دیا جائے۔ اسی راہ میں وہ سب کچھ انہوں نے کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ لیکن ان ہی کے اخلاف ان خوش فہمیوں میں مبتلا ہو گئے کہ یہ جو کچھ بھی کیا گیا تھا اسی لئے کیا گیا تھا کہ اللہ کے بندوں کو اپنا بندہ بنا لیا جائے۔

قرآن میں وہ یہ بھی تلاوت کرتے تھے اور ابتک تلاوت کر رہے ہیں کہ

ماکان لبشر ان یؤتیہ اللہ	"کسی آدمی کو جسے اللہ نے کتاب دی
الکتاب والحکمۃ والنبوۃ	اور حکم و نبوت عطا کی یہ حق نہیں ہے
ثم یقول للناس کونوا	کہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم میرے بندے
عباداً لی من دون اللہ	بن جاؤ بلکہ ان کو اسی کا حکم دیا گیا ہے
ولکن کونوا ربانیین بما	کہ کتاب کو جو تم پڑھاتے ہو اور درس
کنتم تعلمون الکتاب وبما	دیتے ہو اسی کے (علماء) ربانی بن جاؤ
کنتم تدرسون ولا یأمرکم	اور نہ خدا نے اس کا حکم دیا ہے کہ
ان تتخذوا الملائکۃ	کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو (لوگ) اپنا
والنبیین ارباباً ایأمرکم	رب اور پروردگار بنالیں۔ کیا خدا
بالکفر بعد اذ انتم مسلمون	تم کو کفر کا حکم تمہارے مسلمان ہوجانے
سورۂ (آل عمران)	کے بعد دے گا؟" (آل عمران)

لیکن باوجود اس کے خود بھی یہی باور کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی باور کراتے پھرتے ہیں کہ اللہ کے اولیاء اور دوستوں کو خوش کرنے کی تدبیر یہی ہے کہ ان کو اپنا رب بنا لیا جائے اور ان کے ساتھ وہی سب کچھ کیا جائے جس کا مستحق خالق کے سوا اور کوئی نہیں ہے، اللہ اللہ! جس وقت اللہ کے ایک برگزیدہ ولی کے مزار کے آگے یہ سجدہ ہو رہا تھا، میرا خون کھول رہا تھا، کاش! سجدہ کرنے والے صاحب کو یہ دکھانے کی قوت مجھ میں ہوتی کہ نفرت و ملامت بلکہ کہہ سکتا ہوں، کہ لعنت کا کتنا بڑا طوفان تھا، جو صاحب مزار کی روح مبارک سے نکل کر سجدہ کرنے والے اور ان کے سجدہ کا احاطہ کئے ہوئے تھا۔

وہ سمجھ رہے تھے کہ میں ان کو خوش کر رہا ہوں، لیکن ایمانی بصیرت اُن کی اگر روشن ہوتی تو دیکھ سکتے تھے کہ سجدہ کر کر کے صاحب مزار کو یہ سجدے کرنے والے کتنی غیر معمولی اذیت اور دکھ میں مبتلا کر دیتے ہیں وہ اُن کی دعاؤں سے مستفید ہونا چاہتے ہیں، مگر کون سمجھتا ہے کہ بجائے دعا کے اُن کی بد دعاؤں کا نشانہ اپنے آپ کو وہ بنا لیتے ہیں، ان لوگوں کی سمجھ میں اتنی بات بھی نہیں آتی کہ "الملائکہ" یعنی فرشتوں تک کی امداد کو بھی قرآن میں اُن لوگوں کے لئے جنہیں مختص کر دیا گیا ہے، جن کی صفت قرآن ہی میں یہ بیان کی گئی ہے کہ :۔

الذین قالوا ربنا اللہ	"جنھوں نے کہا کہ میرا رب اللہ
ثم استقاموا۔	ہے اور اسی پر ڈٹ گئے"

بدر میں ان ہی روحانی ہستیوں یعنی ملائکہ کی امداد کا تماشا اپنی آنکھوں سے اُن لوگوں نے دیکھا تھا جنہوں نے خالق السمٰوٰت والارض کو اپنا رب بنا لیا تھا۔ اور اسی پر ڈٹے ہوئے جمے ہوئے تھے۔

روحانی قوتوں سے استفادہ کی واحد شکل یہی ہے جس حد تک جو کائنات کے خالق و مالک سے جو جتنا قریب ہوگا اُسی حد تک خدا اور خدا کے مخلوقات بھی اس سے قریب ہوتے ہیں من لہ المولیٰ فلہ الکل "جو خدا کے لئے ہو جاتا ہے اُس کے لئے خدا کی ہر چیز بنتی چلی جاتی ہے"

اُس کی مدد خُدا کے فرشتے بھی کرتے ہیں اور حکم ہوتا ہے تو اسی کی اعانت کے لئے دوسری رُوحانی ہستیاں بھی بھیجی جاتی ہیں۔ لیکن فرشتوں اور ملائکہ کو پُوج کر اُن کی امداد سے پُوجنے والے قریب نہیں، بلکہ دُور ہی ہوتے چلے جاتے ہیں، رحمت و شفقت کے نہیں بلکہ اُن کی لعنتوں اور پھٹکاروں ہی کا مستحق خود بخود اپنے آپ کو بنا لیتے ہیں۔

سورۂ البقرہ کی آیت :۔

والٰہکم اللہ واحد لا الٰہ	"تمہارا الٰہ (معبود) ایک ہی ہے کوئی معبود
الا ھو الرحمٰن الرحیم	اس کے سوا نہیں ہے وہی سب سے زیادہ مہربان
(سُورۃ البقرۃ)	اور سب سے زیادہ رحم والا ہے۔"

سے پہلے پڑھئے، آپ کو یہ الفاظ ملیں گے :۔

ان الذین کفروا وماتوا	"جنھوں نے بات نہ مانی اور مر گئے
وھم کفار اولٰئک علیھم	اُسی حال میں کہ وہ نہ ماننے والے تھے،
لعنۃ اللہ والملٰئکۃ	اُن پر اللہ کی لعنت، فرشتوں کی لعنت اور
والناس اجمعین	عام انسانوں سب کی لعنتیں برستی ہیں، انہی
خالدین فیھا لا یخفف	لعنتوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کا دُکھ
عنھم العذاب ولا ھم	کم ہوگا، اور نہ وہ ڈھیل دئے جائینگے"
ینظرون ؕ	(سورۃ البقرۃ)

بہرحال خُدا اپنے بندوں کی امداد آفتاب سے بھی کر رہا ہے اور ماہتاب سے بھی، ہوا سے بھی، پانی سے بھی۔ لیکن ان مخلوقات سے استفادہ کا یہ طریقہ کہ ان ہی کو پُوجا جائے، اور ان ہی کو معبُود بنا لیا جائے، اسی کا نام شرک ہے۔ اور توحید یہی ہے کہ جس کا سب کچھ ہے، جو کچھ بھی مانگا جائے اُسی سے مانگا جائے، اُسی کے آگے گڑگڑایا جائے، اور یقین رکھا جائے کہ وہی چاہے گا تو اپنی مخلوقات سے ہمیں فائدہ پہونچا سکتا ہے اس سلسلہ میں رُوحانی مخلوقات ہوں، یا غیر رُوحانی سب کا حال یہی ہے ولنعم ما قیل ؎

از خدا خواہم و ز غیر نخواہم بخدا
کہ نیم بندۂ غیر و نہ خدائے دگر ست

ما کان لنا ان نشرک باللہ	"ایک کو نقیر بنا دینے کے بعد سارے جہان
من شیءٍ ذٰلک من فضل اللہ	جہان کی نقیری سے توحید آدمی کو بے نیاز
علینا وعلی الناس ولٰکن	کر دیتی ہے، یقیناً حق تعالےٰ
اکثر الناس لا یشکرون ؕ	کا یہ بڑا فضل ہے۔"
(سُورۂ یوسف)	(سُورۂ یوسف پ ۱۲)

بہرحال میں قصّہ تو سات ٹیڑیوں پر کئے جانے والے سجدے کا کر رہا تھا۔ سجّادہ صاحب دیر تک ٹھیک نماز والے سجدے کی طرح مزارِ مبارک کے آگے سربسجود تھے۔ اس حال کو دیکھ کر دل اتنا پریشان ہوا، کہ اُسی وقت خانقاہ سے جی چاہا کہ نکل جاؤں۔ اِسی کلیر شریف کا وہ روایتی قصّہ یاد آ رہا تھا کہ پُوری مسجد ہی لوگوں پر گر پڑی تھی۔ بار بار دھیان جاتا تھا کہ شاید اس قسم کی جسارتیں حق سُبحانہٗ و تعالےٰ کے غصّہ کو بھڑکاتی ہیں۔ کہیں پُوری خانقاہ کے نیچے ہم لوگ بھی دبا نہ دئے جائیں۔ نمازیوں میں آس پاس کے دیہاتوں سے بھی کچھ لوگ آگئے تھے، اُن میں ایک صاحب غالباً پردیسی مُسافر خیال کر کے میری طرف بڑھے اور پُوچھنے لگے کہ "کیسے آنا ہوا؟ اور اب کیا ارادہ ہے؟" جو واقعہ تھا، عرض کر دیا۔ اُنھوں نے میرے ہاتھ پکڑ لئے اور اصرار کرنے لگے، کہ "تجھے میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔" اور ساتھ لے چلے، میں بھی ساتھ ہو لیا۔ خانقاہ مُبارک سے کچھ فاصلے پر دیکھا کہ کھیتوں کے درمیان کوٹھو کا ایک مکان بنا ہوا ہے دیواریں بھی خام مٹّی کی تھیں۔ لیکن صاف سُتھرا تھا۔ اسی میں لیکر پہونچے، معلوم ہوا کہ یہ اُن کا مزرعہ ہے، جہاں وہ خود کاشت کرتے ہیں۔ مکان بھی بنا لیا ہے اسی میں رہتے ہیں۔ کچھ بیل اور بھینسیں بھی اِدھر اُدھر نظر آئیں۔ الغرض وہ گھر سے خوانچہ میں کھانا لائے جس میں نمکین غذاؤں کے ساتھ سوتیاں اور خالص دُودھ، بالائی سے لبریز پیالہ بھی تھا۔ یُوں مسافرت میں مسافر نوازی جو قطعاً للہ تھی اس کی ایک زندہ شہادت میرے سامنے آئی۔ وہ صاحب کون تھے نہ اُن کا اب نام ہی یاد ہے اور نہ یہ معلوم ہے کہ بیچارے اس دُنیا میں ہیں یا جہاں جانے کے لئے دُنیا میں لوگ آتے ہیں، وہیں جا چکے۔ اُن سے ہی پوچھا کہ منگلور نامی قصبہ اِس علاقہ میں کس طرف ہے، راستہ انہوں نے بتا دیا۔ اور کچھ دُور رخصت کرنے کے لئے بھی شاید ساتھ رہے۔ جب وہ پلٹ گئے، "تو خوب یاد ہے" بندے نے جُوتے بھی پاؤں سے نکال لئے، اور اپنی گٹھری میں اُن کو بھی باندھ لیا۔ گٹھری کبھی

بغل میں رہتی، اور جب تھک جاتا تو یاد آتا ہے کہ سر بھی اسی گٹھری کے اٹھانے کا شرف حاصل ہوتا رہتا تھا۔ مجھے اب بھی معلوم نہیں کہ کلیر شریف سے منگلور کا فاصلہ کتنا ہے؟ لیکن آفتاب جب غروب ہو چکا تھا۔

افتاں و خیزاں کسی نہ کسی طرح منگلور تک پہونچنے میں کامیاب ہو گیا۔ نماز غالباً راستہ میں پڑھ لی تھی۔ اب خیال نہیں رہا کہ عشاء کی نماز ہو چکی تھی یا نہ ہوئی تھی، تھکا ماندہ ایک مسجد میں جو سب سے پہلے سامنے آئی اُسی میں گھس گیا۔ گٹھری حالانکہ کچھ زیادہ وزنی نہ تھی۔ لیکن زندگی میں بار برداری کی مشق کا میرے لئے شاید پہلا موقعہ تھا، یہ گٹھری میرے لیے وبالِ جان بنی ہوئی تھی، رات ہو چکی تھی۔ مسجد میں داخل ہوتے ہی گٹھری صحن مسجد میں پٹک کر لوٹا پانی کے لئے ڈھونڈ رہا تھا۔ لوٹا ملا بھی نہ تھا کہ اچانک مسجد کے حجرے سے برآمد ہونے والے ایک صاحب پر نظر پڑی، جو کڑکتے گرجتے میری گٹھری کی طرف بڑھے اور ہاتھ میں لیکر اُسے تو مسجد کے صحن سے باہر پھینک دیا۔ اور فرما رہے تھے، کہ اسی قسم کے لوگ مسجدوں سے جانمازیں چُرا کر لے بھاگے ہیں، سقایے کو توڑ دیتے ہیں۔ اور بھی طرح طرح کی باتیں وہ نو وارد مسافرین کی جو مسجدوں میں گھس جاتے ہیں اُن کے نام سُناتے رہے، لوٹا بھی نہ ملا، اور ہوش و حواس ہی ان صاحب کے طرزِ عمل سے جاتے رہے۔

تھکا ماندہ چور، اس پُرمسافر نوازی کا یہ نظارہ دل بھی چور ہو گیا۔ گٹھری جو باہر پھینک دی گئی تھی، اُسی کو لینے کے لئے آگے بڑھا، اور بغل میں دبا کر چُپ چاپ کچھ عرض کئے بغیر مسجد سے باہر نکل گیا۔ اور اب دماغ سوچنے لگا کہ اس قلندری رنگ سے کام نہ چلے گا، آگے بڑھ کر میں نے گٹھری سے جُوتے بھی نکالے اور ہلکا سا ایک عمامہ بھی اس میں تھا۔ اسی کو نکال کر سر پر باندھا، ایک اچھے خاصے ملّا، یا نیم ملّا کی شکل اپنی نکل آئی۔ راستہ میں کچھ لوگ ملے پوچھا کہ بڑی مسجد یہاں کی کہاں ہے؟ میں نے پوچھا یا کسی نے خود پتہ دیا۔ بہر حال بڑی مسجد میں اپنی باضابطہ ملاّئیت کے لوازم کے ساتھ داخل ہوا۔ ایک دو صاحب موجود تھے سلام و کلام ہوا۔ پہلی مسجد جس سے نکالا گیا تھا۔ ڈرا ہوا تھا۔ لگا بھی الفاظ کے بعد دار العلوم دیوبند کی طرف منسوب کرتے ہوئے اپنا تعارف ان صاحبوں سے کرانے میں جلدی سے میں نے کام لیا، دیوبند کے لفظ نے دیکھا، کہ آنکھوں میں سب کے اُنس کی کیفیت پیدا کر دی۔ احترام اور اکرام کی اب کیا کمی تھی مسجد میں ایک معقول جگہ میرے ٹھیرنے کے لئے بتا دی گئی، تھوڑی دیر کے بعد اُن ہی صاحبوں میں سے کوئی صاحب خوانچہ لئے ہوئے حاضر ہوئے، تھا تو اس میں ماحضر ہی۔ لیکن جس نے مشکل ہی سے چند میلوں کا سفر پیدل کیا ہو۔ آج خدا جانے کلیر شریف سے منگلور تک کتنے میل طے کر کے پہونچا تھا۔ اس ماحضر کا لُطف حافظہ میں ابتک تازہ ہے قیام گاہ بھی کافی آرام بخش تھی، خُوب نیند آئی۔ راستہ کی خستگی کا صبح کو کوئی اثر باقی نہ تھا، منگلور کس لئے گیا تھا۔ پہونچنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ غرض یہاں پُوری نہیں ہو سکتی دوسرے دن دیوبند لوٹ آیا۔

اِس سفر کا بشرطیکہ اس کو سفر کہا جائے، طالب العلمی کے عہد سے تعلق تھا۔ ذکر جب اس کا چھڑ ہی گیا تو کچھ لکھ دیا گیا۔ تذکرہ اپنے جن دو اسفار کا کرنا تھا۔ اُن کا تعلق اُن دِنوں سے ہے جب طالب العلمی کے دائرے سے نکل کر مدرسہ کے طبقۂ خدام میں یہ فقیر شریک ہو چکا تھا۔ اُس زمانہ میں بکثرت مختلف اغراض و مقاصد کے ماتحت اطراف و جوانب کے شہروں، اور قصبوں میں جانا پڑتا تھا، مجالس میں تقریر و وعظ کے لئے۔ یا دار العلوم سے جن مدارس کا تعلق ہے اُن میں امتحان لینے کے لئے مدرسہ سے یہ فقیر کبھی تنہا کبھی دوسرے علماء کے ساتھ بھیجا جاتا تھا۔ اِس سلسلہ میں بریلی۔ بجنور۔ رُڑکی۔ دہرہ دون۔ فیروزپور حصار، اور کہاں کہاں پُورے طور پر یاد بھی نہ رہا۔ بعض دلچسپ لطیفے اور یاد رہ جانے والے تجربوں اور مشاہدوں سے بھی سابقے پڑے، مگر اُن کے لئے تو کسی الگ مضمون ہی کی ضرورت ہو گی، اِس وقت اپنے وعدے کو پُورا کرنے کے لئے دُو نامور سفروں کا ذکر کر کے آخر میں اِس سفر کے تذکرے پر انشاء اللہ تعالےٰ یہ مضمون ختم کر دیا جائے گا۔ جس کے بعد دار العلوم حسی احاطہ سے باہر نکل گیا +

(باقی آئندہ)

صوفی احمد میاں صاحب لاجپوری رحمۃ اللہ علیہ

(مولانا مرغوب احمد لاجپوری)

مولانا احمد میاں صاحب خلف الصدق حضرت شاہ صوفی سلیمان صاحب کی ولادت ۹ ذیقعدہ ۱۲۹۴ھ بروز چہارشنبہ ہوئی۔ قرآن مجید حافظ احمد اڈے والے اور حافظ احمد مالوپہ صاحب سے پڑھا۔ گجراتی اور اردو کی تعلیم اردو اسکول لاجپور میں حاصل کی، اور ابتدائی فارسی کی کتابیں اپنے والد بزرگوار حضرت صوفی صاحب سے پڑھیں۔ ابتدائی عربی کے اساتذہ کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ حضرت صوفی صاحب ۱۸۹۰ء رنگون تشریف لے گئے اور کچھ عرصے کے بعد مولوی صاحب کو بھی وہیں بلوالیا۔ رنگون میں آپ نے مولانا سلطان احمد پنجابی سے (جو حضرت قاسم العلوم کے تلامذہ میں ایک جید فاضل اور مشہور مناظر تھے اور رنگون میں ایک عربی مدرسہ کے بانی تھے) عربی کی تعلیم کے سلسلہ میں سبعہ معلقہ وغیرہ ادب کی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں حضرت صوفی صاحب نے مولانا کو بغرض تکمیل دہلی بھیج دیا۔ مولانا نے تین چار سال دہلی میں رہکر مختلف علوم و فنون کی کتابیں متعدد اساتذہ سے پڑھیں۔ مدرسہ فتح پوری کے اساتذہ سے بھی تحصیل علم کا موقع ملا، حدیث و تفسیر مولانا رحیم بخش صاحب دہلوی محشی تفسیرات احمدیہ مؤلف حیات ولی سے پڑھیں۔ اور معقولات میں منطق، فلسفہ، ریاضی، اقلیدس، ہیئت، علم کلام وغیرہ کی درسی کتابیں مولانا محمد اسحاق صاحب تلمیذ مولانا عبدالحق صاحب خیرآبادی سے پڑھیں۔ مولانا محمد اسحٰق صاحب پرانی وضع کے اکھڑی طبیعت کے سیدھے سادھے بزرگ تھے۔ لیکن معقولات کے گویا حافظ تھے۔ قاضی مبارک، حمد اللہ، زواہد ثلثہ، شرح مواقف امور عامہ جیسی بلند پایہ کتابیں بغیر کتاب سامنے زبانی پڑھاتے تھے۔ طلبہ کو حکم تھا کہ مطالعہ میں کتاب سمجھ کر میرے پاس آیا کریں۔ پھر مطالعہ میں کوئی مشکل مضمون سمجھ میں نہ آیا ہو تو مولانا سمجھا دیا کرتے تھے۔ مولانا کے اس طرز خاص سے طلبہ میں قوت مطالعہ بہت زیادہ پیدا ہوجاتی تھی اور غور و فکر و تدبر کے بعد مشکل سے مشکل مضامین سمجھنے کا ملکہ پیدا ہوجاتا تھا۔

مولانا احمد میاں صاحب بیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوکر دہلی سے ۱۳۱۴ھ میں لاجپور آئے۔ اس وقت لاجپور اور اس کے اطراف میں تعلیم عربی کا کوئی سلسلہ نہیں تھا صرف راندیر میں مدرسہ اشرفیہ اور کٹھور میں مدرسہ اسلامیہ میں علوم عربیہ کی تعلیم ہوتی تھی۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کے گیارہ سال بعد ۱۲۹۴ھ میں مدرسہ اسلامیہ لاجپور کا افتتاح ہوا جس میں ایک عالم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند سے درخواست کی گئی (راقم الحروف کو اس درخواست کا علم نہ تھا) ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند مجریہ بابتہ رمضان ۱۳۷۲ھ سے یہ معلوم ہوکر بڑی مسرت ہوئی کہ آج سے تقریباً اسّی سال قبل فضلائے دیوبند کی مانگ کرنے والوں میں حضرت شاہ صوفی سلیمان صاحب مہتمم مدرسہ اور ممبران مدرسہ نے یہ کہہ کر کہ "ہم بھی تیرے خریداروں میں ہیں" ایک فاضل مدرس کے لئے درخواست پیش کردی۔ تعلیمی ضرورتوں کے لئے دارالعلوم کو علمی مرکز خیال کرکے ملک کے اطراف و جوانب سے درخواستیں بھی چلی آتی تھیں اس زمانہ میں حال یہ تھا کہ قریب ہی کے علاقوں سے نہیں بلکہ لکھا ہے کہ "ریاست بھاولپور ملک پنجاب سے اور لاجپور ملک گجرات سے مدرسہ ہذا میں (درخواستیں آئی ہوئی ہیں)"۔ یہ مدرسہ کئی سال بحسن و خوبی جاری رہا۔ جس میں مولانا عبدالہادی صاحب اور بھیری اور کوکن کے مولانا احمد علی صاحب وغیرہ علماء درس دیتے رہے۔ سن مذکور کی مطبوعہ روئداد ابتک محفوظ ہے۔ پھر مدرسہ میں تعطل پیدا ہوگیا۔

سنہ ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں مولانا احمد میانصاحب نے للہ فی اللہ مدرسہ اسلامیہ لاجپور کو از سرِ نو جاری کیا۔ اور نہایت تندہی و شوق سے درس نظامیہ کے موافق بالترتیب، باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ جس سے اطراف و اکناف بلکہ دُور دراز کے تشنہ علوم طلبہ نے آپ سے ایک معتد بہ حد تک علوم عربیہ کی تحصیل کی۔ آپ کی باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کے تلامذہ میں سے تقریباً پندرہ صاحبوں نے ہندوستان کے مختلف مدارس میں پہونچکر درس نظامیہ کی تکمیل یعنی علوم شرعیہ تفسیر، حدیث، فقہ کے علاوہ علوم عقلیہ منطق فلسفہ ریاضی میں مہارت تامہ حاصل کی۔ مدارس اسلامیہ ہند کے طرز پر باقاعدہ ترتیب وار علوم عربیہ کی تعلیم و تدریس میں آپ کا درس سنہ ۱۳۲۰ھ کے قبل خصوصیت سے گجرات میں ممتاز تھا جس کا یہ اثر ہوا کہ مدرسہ اشرفیہ راندیر و مدرسہ اسلامیہ کٹھور کے بھی بعض طلبہ مدرسہ اسلامیہ لاجپور میں آگئے۔

ضلع سورت کے اکثر علماء آپ سے مستفید اور آپ کے دامن سے وابستہ ہیں۔ مولانا احمد حسن رح بانی جامعہ ڈابھیل۔ مولانا احمد بزرگ رح سابق مہتمم جامعہ ڈابھیل۔ مولانا احمد درویش رح۔ مولوی صوفی حاجی ابراہیم میانصاحب رح مولوی حافظ ابراہیم پٹیل صاحب کفلیتوی۔ مولانا محمد یوسف صاحب لاجپوری مولوی سید عمر صاحب لاجپوری رح۔ مولوی سید عبدالحی صاحب لاجپوری رح مولوی حافظ عبدالرحمان صاحب رح بھوپالی۔ مولوی وزیر خاں صاحب حیدرآبادی رح مولوی الٰہی بخش پنجابی رح مولوی عبداللہ صاحب رح پنجابی۔ مولوی یحییٰ صاحب رح بنگالی۔ اور ننگ تلامذہ راقم الحروف مرغوب احمد لاجپوری آپ کے ہی دامن فیض سے وابستہ ہیں۔

مولانا مرحوم کو تصنیف و تالیف کا شوق دہلی کی طالب العلمی کے زمانہ ہی سے پیدا ہو گیا تھا جبکہ حضرت صوفی صاحب رح نے اپنے شاذلی سلسلہ کے ایک بزرگ قطب زمان حضرت سید احمد دریس رح کا قلمی رسالہ بنام "عقد النفیس" ترجمہ کے لئے اُستاذ مرحوم کو دیا۔ یہ رسالہ تصوّف کے چار قاعدوں پر مشتمل تھا۔ مولانا نے دو قاعدوں کا اضافہ کرکے نہایت بسط کے ساتھ آیات۔ احادیث۔ اخبار۔ حکایات و تمثیلات و چیدہ چیدہ مفید عربی فارسی اشعار سے مزین فرماکر ایک مستقل کتاب بنام "ہدیۃ المجلیس شرح عقد النفیس" تصنیف فرمائی۔ درس تدریس کے ساتھ ساتھ تراجم کتب کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ایک مرتبہ آپنے نئی روشنی کے ایک شیدائی کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ "عربی میں علوم ہی کیا ہیں، بجز مسائل ضروریہ نماز، روزہ کے اور کچھ نہیں، انگریزی میں جس قدر علوم و فنون ہیں عربی زبان میں اُس کا پتہ بھی نہیں۔" آپنے فوری طور پر اُس کو معقول جواب دیکر ساکت کر دیا۔ اور اُسی وقت یہ ارادہ کر لیا کہ عام فہم سلیس اُردو میں مختصر طور پر ایک رسالہ ایسا تالیف کیا جائے جس میں بہ ترتیب حروف تہجی معہ مختصر حالات اُس علم کے جس میں اُس علم و فن کی تعریف موضوع و غایت سے بحث ہو جس سے خواص و عوام اس امر سے مجملاً آگاہ ہو جائیں کہ عربی میں کس قدر علوم و فنون کا بیش قیمت ذخیرہ موجود ہے اور یہ کہ اُس کا عشر عشیر بھی دُنیا کی کسی زبان میں موجود نہیں۔ چنانچہ "ذخیرۃ العلوم" نامی کتاب اِسی غرض سے تالیف کرنی شروع کی۔ اس کتاب کو ردیف دال تک تحریر فرمایا، جس میں (۱۱۹) تک علم و فن کی تعداد پہونچی ہے۔ مگر بوجہ عوارضات مختلفہ و مشاغل کثیرہ یہ کتاب ناتمام رہ گئی اگر یہ کتاب پُوری ہو جاتی تو اُردو تالیفات کے سلسلہ میں اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہونے کے علاوہ تالیفات عالم کی مختلف شاخوں میں اپنی نوعیت کی بے نظیر کتاب ہوتی جس سے علمائے سلف کے علمی کارنامے۔ ہر علم و فن میں کمال دستگاہ۔ دِقّت نظری و موشگافی کے اعلیٰ جوہر نظر آتے۔ تاہم یہ ناتمام تصنیف بھی اپنی آغوش میں بہت سے اسلامی و عقلی علوم و فنون کو لئے ہوئے ہے۔ دورانِ تصنیف میں آپ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کے بجائے بہتر یہ ہے کہ اس اجمال کو تفصیلی شکل و صورت میں دکھایا جائے۔ یعنی ہر علم و فن کی ایک ایک مستند و متداول کتاب کا سلیس اُردو ترجمہ یا شرح کر دی جائے جس سے علاوہ عربی داں حضرات کے اُردو خواں بھی علوم عربیہ سے بالتفصیل آگاہ باخبر ہو سکیں اور اپنے حوصلہ و استعداد کے مُطابق فائدہ حاصل کر سکیں۔

جس عظیم الشان کام کا آپنے بیڑا اُٹھایا تھا اُس کا پورا کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ اس کی انجام دہی میں استقامت قلب اور وسیع حوصلہ اور بڑے دل و دماغ کی ضرورت کے علاوہ فراغ بالی و جمعیت قلب کے ساتھ ایک غیر محدود زمانہ کی ضرورت تھی۔ تب کہیں جاکر ایک عرصۂ دراز

کے بعد یہ امر اہم بوجہ احسن سر انجام پایا۔ اس کے پورا کرنے کا ولولہ اور طبعی شوق آپ کے قلب میں نہایت پختگی کے ساتھ جاگزیں ہو چکا تھا اور ہر وقت ملہم غیب کی بے نیاز بارگاہ سے نہایت خلوص کے ساتھ اس امر اہم کے اختتام کے متمنی رہا کرتے تھے۔

چنانچہ آپ نے دفعتاً ایک ساتھ بہت سی کتابوں کے ترجمے اور شرح کا کام شروع کر دیا۔ اور متعدد کتابوں کے ترجمے اور چند شرحیں لکھیں۔ اصول حدیث میں "نخبۃ الفکر" اصول فقہ میں "مسلّم الثبوت" کی اردو شرح۔ صرف میں "شافیہ" نحو میں "کافیہ" اور "الفیہ"۔ علم معانی میں "تلخیص المفتاح"۔ علم حکمت میں معلّم ثانی ابو نصر فارابی کی کتاب "فصوص الحکم"۔ منطق میں شیخ الرئیس بو علی سینا کے منظوم رسالہ "عیون المسائل"۔ ہیئت میں "تصریح" علم کلام میں "قصیدہ بدأ مالی" وغیرہ کتابوں کی شرحیں نہایت بسط سے لکھیں۔ تصوّف میں "لوائح جامی و جواہر الحقائق"۔ مناظرہ میں "مناظرہ رشیدیہ" اور ریاضی میں "خلاصۃ الحساب"۔ حکمت میں "ہدیہ سعیدیہ"۔ منطق میں "شرح تہذیب"۔ عروض و قوافی میں "عروض المفتاح"۔ "تہذیب الاخلاق" میں "ہدایۃ الہدایہ" اور "ہدیۃ الجلیس ترجمہ عقد النفیس"۔ کتاب تعلیم المتعلم کا ترجمہ "دلیل الطالب الی مناہج المطالب"۔ حضرت امام غزالیؒ کی فاتحۃ العلوم کا ترجمہ۔ حضرت جلال الدین سیوطیؒ کے چند رسالوں کا خلاصہ "توجیہ العنان الی ان ابوی رسول اللہ فی الجنان"۔ آخیر کی چار کتابیں اور ذخیرۃ العلوم یہ پانچ کتابیں ۱۳۲۸ھ میں طبع ہو چکی ہیں۔ فقہ میں آپ کو یہ خیال دامنگیر ہوا کہ سلیس اردو میں ایک مستقل مبسوط کتاب جو قریب قریب تمام کلیات و جزئیات کو حاوی ہو، مع دلائل تحریر کریں۔ بنابریں اس موضوع پر آپنے قلم اٹھایا اور چند روز میں اس کا مقدمہ لکھا۔ جس میں رؤس ثمانیہ اور موضوع علم کی بحث قابل دید ہے۔ مذکورہ بالا جو کتابیں آپ کو شرحاً یا ترجمۃً حل کرنے کا اتفاق ہوا، ان میں بعض مکمل ہیں اور بعض ناتمام رہیں۔ پھر یہ سلسلہ یک لخت موقوف ہو گیا۔ اور آپ کو اس سلسلہ کی کتابوں کے طبع کرانے اور ناتمام کتابوں کے پورا کرنے کا اتفاق نہ ہو سکا۔

ما کل ما یتمنی المرء یدرکہ
تجری الریاح بما لا تشتہی السفن

واللہ غالب علیٰ امرہ۔ افسوس ہے مولٰنا مرحوم کی یہ آرزو بھی پوری نہ ہونے پائی تھی کہ حیات مستعار کا مختصر پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اور دو ماہ کی علالت کے بعد مورخہ ۲ شعبان ۱۳۲۷ھ بروز سہ شنبہ (۲۴ اگست ۱۹۰۹ء) کو عین عالم شباب میں بعمر (۳۳) سال وفات پائی۔ مادۂ وفات "ادخلہ الحق فی جنتہ" ہے اور تاریخی نام "حفیظ الدین عاقل" ہے۔

بعض موزوں طبع احباب نے تاریخ وفات میں بطور مرثیہ چند قطعے موزوں کئے ہیں ان میں سے ایک مرثیہ کا انتخاب ہدیۂ ناظرین ہے:-

"مولوی احمد میاں چوں کرد رحلت از جہاں
بر وصال پر ملالش چوں نگرید آسماں
عالم و فاضل مقرر صاحب فکر رسا
خوشہ چیں مجلسش بودند جملہ این و آں
شغل تدریس و کتب بینی غذائے روح او
بود مرد فلسفہ داں فخر ابنائے زماں
فی البداہت نظم کردے ہر چہ در دل آمدے
دستگاہش تام بد بر فارسی عربی زباں
مولد و ہم مرقدش یک موضع دار السرور
جائے مردم خیز و دلکش لاجپور آمد نشاں
از توابع ہائے سورت تحت نواب سچیں
شد مدور رود بار خردش از پہلو رواں
سال ترحیلش ز فضلی گر بپرسی اے نکو
یک ہزار و سہ صد و ہم بست و ہفت از ہجریاں
شد غروب آفتاب علم میگوئی تواں
بعد مغرب چونکہ آمد در زمیں تدفین آں"

(مولنا تجمل حسین صاحب بھروچی)

تنقید و تبصرہ

(سید محمد ازہر شاہ قیصر)

آلۂ مکبر الصوت!

از مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی

سائز ۲۰×۲۶ ضخامت ۴۸ صفحات کتابت

طباعت اور کاغذ بہتر ۔ ملنے کا پتہ :-

دار الاشاعت، بندر روڈ، کراچی ۱

مولانا محمد شفیع صاحب اپنی اس خصوصیت میں انفرادیت رکھتے ہیں کہ سائنس کی روز افزوں ترقیات نے دینی مسائل و معاملات کو جہاں جہاں زد پہنچائی مولانا نے کامل تحقیق کے بعد وہاں مسائل شرعیہ کو نکھار کر پیش کیا، اور مادی ترقیات کی نظر فریبی اور ظاہر آرائی سے عوام کو محفوظ رکھنے کی سعی کی۔ اس رسالہ میں آپ نے آلۂ مکبر الصوت کے متعلق بہت سے ماہرین کی تحقیق پیش کی ہے اور اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آلہ پر بولنے والے کی اصل آواز پھیلتی ہے آواز کا عکس یا صدائے بازگشت نہیں۔ اس تحقیق کو سامنے رکھ کر مفتی صاحب نے آلۂ مکبر الصوت کے استعمال کے مفاسد پر مفصل گفتگو کی ہے۔ مولانا کی رائے ہے کہ نماز میں اس آلہ کا استعمال نہ کرنا چاہیے اور امام کی تکبیرات انتقال کا ابلاغ اسی طرح مکبرین کے ذریعے ہونا چاہیے جس طرح خیر القرون سے اس وقت تک ہوتا چلا آیا ہے، ساتھ ہی مولانا نے جواز کی یہ صورت بھی نکالی ہے کہ اگر کسی جگہ نماز میں اس آلہ کے استعمال کی نوبت آ جائے تو وہاں نماز کے فساد کا حکم نہیں دیا جائے گا، اور جب تک کوئی امر موجب فساد و اعادہ متحقق نہ ہو، یہ نماز واجب الاعادہ بھی نہیں ہوگی۔ کتاب پر علماء دیوبند، سہارنپور، خیر المدارس ملتان، علامہ زاہد کوثری مرحوم کی تقریظیں اور تصدیقیں بھی حاصل کی گئی ہیں۔ نئے تعلیم یافتہ حضرات جو نماز میں آلۂ مکبر الصوت کے استعمال پر اصرار کرتے ہیں اور اس کے لئے جواز و اباحت کی شکل پیدا کرنے کے خواہشمند ہیں اس رسالہ کو تحقیقی نظر سے ضرور پڑھیں۔

پندرہ روزہ "نور"!

سالانہ چندہ ۳ روپے۔ ایڈیٹر ابو سلیم عبد الحی، مائل خیر آبادی۔ پتہ :-

دفتر "نور" رامپور، یو۔ پی۔

یہ دفتر "الحسنات" رام پور کی طرف سے چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے ایک دینی پندرہ روزہ رسالہ جاری کیا گیا ہے۔

بچوں کے ان پرچوں کے مقابلہ میں جو انھیں بیہودہ کہانیوں اور فلم و تصویر کی دلچسپیوں میں کھو دینے پر مامور ہیں۔

اس پرچہ کے مضامین کافی سلجھے ہوئے ہیں اور مضامین کا معیار بچوں کے ذہن سے موافقت کرتا ہے۔

ہماری خواہش ہے کہ ادارہ "نور" اس رسالہ کو اپنا مخصوص جماعتی رنگ نہ دے، اور اس میں قرآن و سنت کے حقائق، اپنے خیالات کی آمیزش کے بغیر شائع کئے جائیں۔

رسالہ کی کتابت، ترتیب اور کاغذ میں اصلاح کی گنجائش ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کے واقعات زندگی، اگر رسالہ میں پابندی سے شائع کئے جائیں تو ان سے بچوں میں ایثار و تقویٰ، نیکی اور استقامت علی الحق کا صحیح جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔

پاکستانی خریدار! رسالہ "دار العلوم" کے حساب میں کوئی رقم رسالہ "ندائے حرم" کو روانہ نہ کریں، جو قدیم و جدید حضرات رسالہ "دار العلوم" کے خریدار بننا چاہیں وہ صرف اپنی خریداری کی اطلاع دفتر رسالہ "دار العلوم" کو دیں۔ (ناظم)

ادبیات

مرثیہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

(از حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ)

"ہم سے پہلے جو لوگ عالمِ آخرت کا سفر کر جاتے ہیں اُن سے ہماری جدائی کی مدت اگرچہ غیر معین ہے۔ لیکن بہر حال عارضی ہے کہ اس دُنیائے جنانِ جاوداں میں ہم سب کو ایک نئی زندگی کے ایک نئے تصور اور زمان و مکان کے قیود سے آزاد ہو کر باہم اکٹھا ہو جانا ہے ؎ وما هٰذه الحیٰوة الدنیآ الا لهو ولعب وان الدار الاخرة لهی الحیوان لو کانوا یعلمون۔ لیکن ایک محبت کرنے والے کے لوحِ دل پر یہ عارضی جدائی بھی کیا داغِ حسرت ڈال جاتی ہے، اس کا اندازہ ذیل کے مرثیہ سے ہو سکتا ہے جو حضرت شیخ الہندؒ سے باکمال شاگرد نے اپنے استاذ حضرت مولانا نانوتوی رح کی وفات پر کہا ہے۔ (سید محمد ازہر شاہ قیصر)

ہر چشم مثل ابر ہے کیوں اشکبار حیف
ہر سینہ مثل لالہ ہے کیوں داغدار حیف

کس کی لگی ہے یہ نظرِ بد جہان کو
دم میں ہوئی خزاں سے مبدل بہار حیف

ہے کیا سبب جہان میں آتا نظر نہیں
جز آہ دردناک و دم شعلہ بار حیف

زیب جبین ماہ جبیں کیوں ہے داغِ غم
زخمی جگر ہے کیوں گہر آبدار حیف

مسکن پذیر دل میں ہے کیوں رنج و یاس و آہ
سب خواہشوں نے دل سے کیا کیوں فرار حیف

یہ کس کی تیغِ غم نے کیا قتلِ عام آج
جاتا ہے شورِ نالہ جو گردوں سے پار حیف

ہر ایک کی زباں پہ ہے جاری دعاء مرگ
آتا نظر ہے ہر کوئی زار و نزار حیف

دشنہ کا کب گلو کو بھلا اشتیاق تھا
صبر و سکوں سے آتا تھا کب ہم کو عار حیف

کل تو آرزو تھی ہمیں عمرِ خضرؑ کی
ہر دم اجل کا آج ہے کیوں انتظار حیف

یہ کون اُٹھ گیا ہے کہ جی بیٹھا جائے ہے
یہ کون چھپ گیا کہ ہے حشر آشکار حیف

خورشیدِ علم آج ہوا کون سا غروب
عالم تمام کیوں نظر آتا ہے تار حیف

یہ کون چل بسا ہے کہ جس کے فراق میں
آتا زباں پہ ہے یہی بار بار حیف

آنکھوں میں جوشِ اشک ہے سینہ میں درد ہے
دل میں غم و الم ہے زباں پر ہزار حیف

ٹکڑے ٹکڑے سینہ ہوا چاک چاک ہائے
دل پارہ پارہ جامہ ہوا تار تار حیف

مونس الم رفیق فغاں غمگسار غم
ہمدرد و ہم نفس اُف یارِ غار حیف

ہر بات جس کی مایۂ صبر و شکیب تھی
نالاں ہے اُس کے ہجر میں اب بیقرار حیف

؎ اور یہ دُنیا کی زندگی تو نرا کھیل تماشا ہے اور بیشک جو پچھلا گھر ہے حقیقت میں وہی زندگی ہے، کاش وہ اس بات کو جانتے۔"

جو باعثِ نشاطِ دلِ ناصبور تھا
روتے ہیں اُس کے ہجر میں اب زار زار حیف

جب باعثِ حیات ہی ہو موجبِ ممات
اللہ کیا کرے دلِ اُمیدوار حیف

ہاں اے اجل خدا کے لئے چشمِ التفات
بے روئے یار زیست ہے اب ہم کو بار حیف

کیسی خوشی کہاں کی ہنسی کیا نشاط و عیش
وردِ زباں اب تو ہے لیل و نہار حیف

زیرِ زمیں ہی چل کے رہو ہمدمو کہ ہاں
کچھ لطف زندگی نہیں بے روئے یار حیف

اُس مایۂ حیات کی فرقت میں یا نصیب
ہو پائیدار ہستی ناپائیدار حیف

اوروں کی زندگانی پہ ہو خاک دسترس
اپنی تو موت پر بھی نہیں اختیار حیف

پھولا نہیں سماتا ہوں کہتا ہے جب کوئی
کیا اعتبارِ ہستیٔ بے اعتبار حیف

بنجائے اپنے واسطے خضرِ رہِ عدم
ملتا نہیں ہے ایسا کوئی دوستدار حیف

کیوں کر کہوں نہ موت سے بدتر حیات کو
غم جی میں درد سینہ میں دل میں غبار حیف

جتنی تھیں خواہشیں ہوئیں یاس سے بدل
شاخِ اُمید لائی تو کیا لائی بار حیف

وہ دیوبند رشکِ ارم جس کا تھا لقب
کہتا ہے عالم آج اُسے دشتِ خار حیف

عالم سے ظلِ رحمتِ حق جبکہ اُٹھ گیا
رہ رہ کے کیوں نہ آئے مجھے بار بار حیف

"تقریرِ دلپذیر" ہو جس کی غذائے رُوح
وہ لقمۂ اجل ستمِ روزگار حیف

کشافِ دین و کتمِ عدم وائے بختِ بد
شمس الہدیٰ و پردہ نشینِ غبار حیف

بادِ خزان و گلشنِ دین اے زمانہ آہ
برقِ فنا و خرمنِ صبر و قرار حیف

عیسیٰ دم اور صرصرِ مرگ اے فلک دریغ
گنجِ علومِ وہبی و کنجِ مزار حیف

موسائے وقت و سحرِ اجل وا مصیبتا
خضرِ زمان و گوشہ نشینِ حصار حیف

یوسف لقا و چاہِ لحد ہمدمِ الحذر
دیوِ قضا و آصفِ دوران شکار حیف

کشتیٔ نوح و صدمۂ طوفان الاماں
طغیانیٔ حوادث و کوہِ وقار حیف

جورِ سپہر و تکیہ گہِ بیکساں فغاں
الطافِ مرگ و عالمِ شب زندہ دار حیف

زیرِ زمین طائرِ عرش آشیاں اُف
بالائے چرخ زیب دہِ روزگار حیف

تحت الثریٰ و چشمۂ آبِ بقا غضب
سنگِ مصائب و شجرِ باردار حیف

وقفِ سموم ہو گلِ شاداب ہائے ہائے
پامالِ خاکِ رہ ہو دُرِ شاہوار حیف

گو دم نہیں پہ نکلے ہے دل سے یہی صدا
پژمردہ آہ ہو گلِ خنداں ہزار حیف

جائیں عدم میں یوں کرم و فضل وجود آہ
۱۲۹۷ھ
عالم ہو اور حسرت و ماتم ہزار حیف
۱۲۹۷ھ

فقر و ہنر کمال و سخا جود و اتقا
دستِ قضا سے بے سر و پا ہوں ہزار حیف
۱۲۹۷ھ

مل جائیں فضل و علم و عمل اب زمین میں
پیوندِ خاک زہد و سخا ہوں ہزار حیف
۱۲۹۷ھ

سید علی احمد کاتب

(۳ ربیع الاول سنہ ۱۳۷۳ھ)

سلطان ابنِ سعود کی وفات پر

"دارالعلوم" میں جلسۂ تعزیت!

۱۰ر نومبر ۱۹۵۳ء کو صبح کے ریڈیو نے یہ المناک اطلاع نشر کی کہ "ہز مجسٹی سلطان ابن سعود والیٔ نجد و حجاز وفات پا گئے"۔ خبر کے موصول ہوتے ہی دارالعلوم کے تمام حلقوں اور احاطوں میں غم والم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور اُسی وقت حضرت الحاج مولانا محمد طیب صاحب کی تحریک پر تمام اساتذہ طلباء اور کارکنانِ دفاتر دارالعلوم کی تاریخی عمارت نودرہ میں جمع ہو گئے۔ جہاں سب نے مل کر قرآن کریم اور کلمۂ طیبہ کا ختم کیا۔ ختم کے بعد حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ نے ایک مفصل تقریر فرمائی۔

حضرت مہتمم صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ سلطان مرحوم کا حادثۂ عظیم صرف اہلِ حجاز ہی کے لئے جانکاہ نہیں ہے بلکہ یہ پورے عالمِ اسلام کے مشترک اور عظیم صدمہ ہے۔ اور جماعت علماء کے لئے اس حادثہ کی اہمیت خصوصیت اور زیادہ اس وجہ سے ہو جاتی ہے کہ سلطان مرحوم صرف ایک بادشاہ ہی نہیں بلکہ ایک متبحر عالمِ دین بھی تھے اور موقع بموقع آیات و احادیث سے استشہاد اور فکر صحیح کے ساتھ استنباط نتائج ان کی قابل قدر اور نمایاں خصوصیت تھی، اس کا ذاتی طور پر اندازہ مجھے ۱۳۵۳ھ میں اُس وقت ہوا کہ جب سلطان مرحوم پر مطاف میں ایک شیعہ نے تلوار سے حملہ کیا تھا۔ لیکن حق تعالےٰ نے سلطان کو اس زد سے محفوظ رکھا۔ اس سال اتفاقاً اکثر ممالک کے مختلف مشاہیر حجاج میں شریک تھے علماء ہند نے اس موقعہ پر جلسۂ تہنیت منعقد کرنے کی تجویز کی اور مطبوعہ دعوت نامے میری اور جناب مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی اور جناب حافظ ہدایت حسین صاحب مرحوم کانپوری کی طرف سے جاری کئے گئے یہ جلسہ مکہ مکرمہ کے سب سے بڑے ہوٹل کے وسیع صحن میں منعقد کیا گیا جس میں سلطان کو حملے سے محفوظ رہنے پر مبارکباد کا ریزولیوشن پاس کیا گیا۔ میں نے اُس جلسہ کی کارروائی اور تجویز مبارکباد کا عربی ترجمہ کیا جلسہ نے ایک وفد کی تشکیل کر کے مجھے اُس کا صدر بنایا۔ تاکہ یہ وفد جلسہ کی تمام کارروائی سلطان کی خدمت میں پیش کرے۔ چنانچہ گیارہ علماء ہند پر مشتمل جس میں مولانا آزاد سبحانی، مفتی محمد نعیم صاحب، مولانا نجم الدین صاحب لاہوری پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور وغیرہ حضرات شامل تھے ایک وفد سلطان کے یہاں باریاب ہوا۔ عموماً سلطان مرحوم وفود اور اشخاص کی ملاقات کے لئے ایک بڑے رسمی ہال میں برآمد ہوتے۔ جہاں ملاقاتی پہلے سے بٹھا دیئے جاتے تھے سلطان کے برآمد ہوتے ہی سب تعظیماً کھڑے ہوتے اور آدابِ شاہی بجا لاتے۔ لیکن سلطان مرحوم کی یہ حدود شناسی اور علم توقیری کس قدر قابلِ صد تحسین ہے، کہ اُنہوں نے فرمایا کہ میں یہ کسی طرح گوارا نہ کروں گا کہ علماء میری تعظیم کے لئے کھڑے ہوں یہ میرا فرض ہے کہ اُن کی تعظیم بجا لاؤں اس لئے انھیں میرے ذاتی کمرے میں ہی بلا لیا جائے۔ ہم لوگ وہاں پہونچے تو سلطان اپنے شہ نشین سے اُتر کر کمرے کے دروازے پر آ گئے سب سے پہلے بحیثیت صدر وفد مجھ سے مصافحہ فرمایا پھر دوسرے حضرات سے مصافحے کئے جن کا میں تعارف کراتا رہا۔ اور جب تک ارکانِ وفد اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ نہیں گئے سلطان خود نہیں بیٹھے۔

اِس وفد کے ترجمان و صدر کی حیثیت سے میں نے باجازت سلطان مرحوم مختصر تقریر کے بعد کارروائی جلسہ اور تجویز تہنیت پڑھ کر سنائی۔ جواباً سلطان نے تقریباً آدھا گھنٹہ تقریر فرمائی جو کلمات تشکر و امتنان فصاحت بلاغت آیات و احادیث سے بینظیر طرز استشہاد سے لبریز تھی۔ سلطان نے فرمایا کہ میں اپنے ہندوستانی بھائیوں کا بے حد ممنون ہوں کہ اس مبارک موقعہ پر انہوں نے ہی پہل کی اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ہندوستانی مسلمان ہر خطہ کے مسلمانوں کی ہمدردی اور اعانت و حمایت میں پیش پیش رہتے ہیں اور ایک امتیازی شان رکھتے ہیں اس لئے میں اُن کا بیحد ممنون ہوں،

ساتھ ہی یہ حسنِ اتفاق ہے کہ مسلمانانِ ہند عموماً حنفی ہیں اور مجھے مذاہب اربعہ میں حنفیہ کی طرف خاص رجحان ہے، چنانچہ "عقیدہ الطحاوی" میں نے اپنے ذاتی خرچ پر طبع کراکر اُسے شائع کرایا، اِسی طرح اور بھی متعدد کتب حنفیہ کی میں نے اشاعت کی ہے فرمایا کہ میری حکومت کے تین بنیادی مقصد ہیں، ایک کتاب وسنت کی ترویج۔ دوسرے شعائر اللہ کی تعظیم۔ تیسرے اتحاد بین المسلمین، اِن مقاصد کے لئے میری جان مال اور میری تلوار اور حکم سب کچھ وقف ہے۔ آخر میں پھر مکرر شکریہ مسلمانانِ ہند کا ادا کرکے فرمایا کہ یہ وفد میرا ترجمان بنکر میرا شکریہ مسلمانانِ ہند تک پہنچا دے ختم جلسہ پر مجھے اور مولٰنا محمد نعیم صاحب کو خلعت سے سرفراز فرمایا۔ اور بہت سی اہم اور اعلیٰ کتابیں جیسے تفسیر ابن کثیر اور البدایہ والنہایہ اور "المغنی" وغیرہ عنایت فرمائیں جس سے سلطان کے دینی اور علمی مذاق سلیم اور تبحر کا اندازہ ہوا علمی حیثیت کے علاوہ اس وجہ سے بھی سلطان مرحوم کی ہستی مغتنم تھی کہ ان کی ذاتی زندگی پر رنگِ دیانت غالب تھا جبکہ آج کے دور میں یہ ذوقِ دیانت و احتیاط اول تو مفقود ہے اور شاہیت و اقتدار کے ساتھ تو اس کا ہونا گویا ایک ناممکن کو ممکن کہنا ہے۔

آگے چل کر حضرت مہتمم صاحب نے فرمایا کہ سلطان کے طریقِ حکومت کو بجا طور پر اسلامی ملوکیت عادلہ کہا جاسکتا ہے اس میں اگر صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کا رنگ نہیں تھا تو امیر معاویہؓ کا طرز سیاست ضرور تھا جس کی بنیاد عدل پر تھی، اور آج کے دور میں اسلامی حکومت کو ناممکن کہنے والوں کے لئے سعودی حکومت ایک نمونہ تھی، کہ جس سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔ ان کی حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ اسلامی احکام کا استعمال تھا جس کی نمایاں برکت یہ تھی کہ خطۂ حجاز آج امن وسلامتی کا پوری دنیا میں واحد اور بےمثال دارہ ہے، اس کا صحیح اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جنہوں نے ان سے پہلے کے دور کی بدامنی۔ قتل وغارت۔ راہوں کی بے امنی۔ قافلوں کی لوٹ مار اور سرِراہ چوریاں وغیرہ دیکھی ہیں اور حرم آمن کے چوگرد یتخطف الناس من حولھم کا منظر نمایاں رہتا تھا سلطان نے نظم مملکت ہاتھ میں لیتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ ملک سے بدامنی کا سدباب کیا جس کا بڑی حد تک فائدہ اطرافِ عالم سے آنے والے حجاج کو پہونچا اور پہونچ رہا ہے۔ اسی ذیل میں حضرت مہتمم صاحب نے فرمایا کہ حضرت مولٰنا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ جب حج کے لئے تشریف لے گئے تو مستورات بھی ساتھ تھیں حضرت موصوف نے سب ساتھیوں کا روپیہ تین تکیوں میں رکھوا دیا کیونکہ وہ بستر کی وجہ سے ساتھ رہتے تھے اور حفاظت بھی رہتی تھی۔ مکہ معظمہ سے جب مدینہ منورہ روانہ ہوئے تو رات کو اتفاقاً یہ ہی تینوں تکیے اونٹوں پر سے گر گئے اور اس کا علم مدینہ منورہ پہونچکر ہوا۔ بہت پریشان ہوئے اور قاعدہ کے مطابق رپورٹ درج کرائی۔ والیٔ مدینہ نے تفتیش معلوم کرکے مولٰنا سے کہا کہ پرسوں آپ آکر اپنا سامان لے لیجئے گا۔ اور اُسی وقت حکم جاری کیا کہ اس شب میں پڑنے والی منزلوں کے آس پاس کے رہنے والے بدوؤں، نوجوانوں اور بوڑھوں کو گرفتار کرلیا جائے اور ان کے اہلبیت کو بلاکر کہا کہ ان منزلوں کے درمیان بعض حجاج کا سامان ضائع ہوا ہے اُسے حوالے کردو، ورنہ ان سب کو قتل کردیا جائے گا۔ یہ دھمکی کارگر ہوئی اور چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تمام گرا پڑا سامان جس میں مولٰنا کے تینوں تکیے بھی تھے مدینہ پہونچ گیا۔ والیٔ مدینہ نے مولٰنا کو تیسرے روز ان کا سامان بجنسہ سپرد کرکے رسید لے لی اور گرفتار شدگان کو رہا کردیا۔ ایسے ہی حدود وقصاص کے اجراء کے سبب وادیٔ حجاز میں جرائم محدود ہی نہیں بلکہ تقریباً مسدود ہیں۔ چوری ثابت ہوجانے پر قطع ید (ہاتھ کاٹنے کی سزا) فوراً جاری کردیجاتی ہے اور کٹے ہوئے ہاتھ باب حکومت پر لٹکا دیئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے، کہ اس عبرتناک منظر کے دیکھنے کے بعد چوری کا تصور تک ذہنوں میں نہیں آسکتا ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ آج پوری وادیٔ حجاز میں ایک ایک فرد خواہ مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا بوڑھا، حجازی ہو یا آفاقی اپنی جان ومال کو کسی بھی جگہ غیر محفوظ نہیں سمجھتا۔ میں اگر آج کے اصطلاحی الفاظ میں یہ کہدوں تو مجھے معاف کیا جائے کہ یہ سب کچھ اُسی مُلّا ازم کی برکت ہے جو آج بنظرِ حقارت دیکھا اور بعنوانِ حقیر ذکر کیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کا امن ہی ان اسلامی اصول، اور اسلامی طرز حکومت سے وابستہ ہے۔ اگر آج کے دور میں یہ طرز عملاً ناممکن تھا تو آخر سلطان نے اس ناممکن کو کس طرح ممکن بناکر دکھا دیا، اور اس کے نتائج خیر سے دنیا کے قلوب اور دماغوں کو سرشار، اور مشکر گذار بنادیا۔ اگر یہ طرز حکومت ایک جگہ ممکن ہے تو دوسری جگہ بھی

ممکن ہے، کاش اس سے موجودہ مسلم حکومتیں بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ غیر مسلم حکومتیں بھی سبق سیکھیں، حکومتوں کا ضعف یا انکی بے مائگی ہماری غفلتوں اور خود غرضیوں سے وابستہ ہے نہ ان اصول سے جب بھی دنیا میں امن ہوگا اپنے اصول سے ہوگا اور جب جرائم اور منکرات کا سدِّباب ہوگا اسی طرزِ حکمرانی سے ہوگا، یہ الگ بات ہے کہ جرائم ہی کو عزائم سمجھ لیا جائے اور اس کو مٹانے کی بجائے اس کو پائیدار بنانے کی کوشش کی جائے۔

بہرحال سلطان مرحوم اس [illegible] میں اپنی مثال خود تھے جن کی روش ہر آئینہ مقتدر اداروں کے لئے قابلِ تقلید ہے۔

اسی طرح سلطان ابن سعود کے دورِ مسعود کے رفاہی اقدامات بھی قابلِ تحسین ہیں کہ جن سے ہر سال لاکھوں بندگانِ خدا بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ پانی کا حصول حجاز میں جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا لیکن اب وادیٔ فاطمہ سے نکلنے والے چشمہ سے پائپ کے ذریعہ حجاج اور شہریوں کی قیام گاہوں اور گذرگاہوں تک اس کا پانی پہنچا دیا گیا ہے، اور صاف ستھرا اور شیریں پانی آج بلا منت اور بغیر خرچ ہر شخص حاصل کر سکتا ہے۔ ادھر حرمین شریفین کی مبارک و بےمثال خدمت۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان بہترین و عمدہ سڑک کی تیاری، جدہ میں اعلیٰ ترین بندرگاہ، اور بندرگاہ سے متصل عظیم الشان مدینۃ الحجاج، سعودی ٹیکس کی معافی سلطان مرحوم کی ایسی باقیات صالحات ہیں کہ جنہوں نے سلطان مرحوم کو پورے عالم اسلام کا محسن بھی بنا دیا ہے۔

بہرحال دنیوی لحاظ سے بھی سلطان معزز اور مؤقر ترین انسانوں میں سے تھے جس کے لئے اُن کا شاہانہ عظمت و جلال کافی تھا لیکن خدمتِ حرمین کے منصبِ عظیم اور کما حقہٗ اس فرض اور حقوق حجاج کی ادائگی نے مسلمانان عالم کے دلوں کو ان کی نیازمندانہ عقیدت و محبت سے بھر دیا تھا۔ حاصل یہ ہے کہ سلطان مرحوم اپنے ذاتی فضائل و مناقب کی رو سے بھی موجودہ دور کے سلاطین میں ایک امتیازی شان رکھتے تھے، اپنے طرزِ حکومت کے لحاظ سے بھی سابقین کی یادگار اور اسلامی اندازِ حکومت کے حامل تھے اور اپنی خدمات کے لحاظ سے بھی بہترین زعیم اور محبوب القلوب لیڈر تھے اور اپنے علم و فضل کے لحاظ سے بھی ایک مفکر فاضل تھے۔

ان چند در چند فضائل و مناقب کے لحاظ سے انکی وفات کا یہ سانحۂ عظیم اسلئے بھی جانگداز ہے کہ یہ ایک عظیم المرتبت عالمِ دین کی موت ہے اس لئے بھی روح فرسا ہے کہ یہ ایک اسلامی فرمانروا کی موت ہے، اس لئے بھی جانگسل ہے کہ یہ ایک وسیع الاخلاق اور دردمندِ امت کی موت ہے، اس لئے بھی ہوشربا ہے کہ یہ پورے عالم اسلامی کے ایک محسن کی موت ہے۔ طاب اللہ ثراہ و جعل الجنۃ مثواہ۔

حضرت مہتمم صاحب کے مؤثر انداز تقریر نے مجمع کو بیحد متاثر کیا ایک گھنٹے کی اس مفصل تقریر کے بعد حضرت موصوف نے دعاء کا اعلان فرمایا۔ اور علماء وطلباء کا یہ مجمع عظیم کافی دیر تک جناب باری میں بخشوع و خضوع سلطان مرحوم کے لئے دعائے مغفرت و پسماندگان خاندان شاہی کی بقاء و سلامتی اور ولیعہد معظم امیر فیصل آلِ سعود کے لئے پیشرو معزز باپ کی روشن روایات کو زندہ رکھنے کی مستجاب دعائیں مانگتا رہا، اور ایصالِ ثواب کیا گیا۔ حق تعالےٰ اِن مخلصانہ دعاؤں کو قبول فرمائے۔

مندرجہ ذیل تجویز تعزیت باتفاق منظور کی گئی، اور بذریعہ تار بتوسط عالی جناب قونصل صاحب نجد و حجاز متعینہ بمبئی ولی عہد کی خدمت میں ارسال کی گئی۔ تجویز تعزیت یہ ہے:-

تجویز

مرکز علوم دین دار العلوم دیوبند کے اساتذہ طلبہ اور تمام اسٹاف کا یہ جلسہ والیٔ نجد و حجاز سلطان معظم عبد العزیز آل سعود کی وفات حسرت آیات پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے، سلطان مرحوم عالم اسلام کی بلند پایہ شخصیت اور موجودہ دور کے ایک نہایت ہی با اقبال اور متدین اور جامعٔ علم و دین فرمانروا کی حیثیت سے منفرد شخصیت تھے۔ آپ نے نہ صرف نجد و حجاز کو ہر نہج سے بام ترقی پر پہنچایا بلکہ حرمین شریفین کی بےمثال خدمت اور زائرین و حجاج کے لئے انتہائی [illegible] سہولت و امن اور راحت و آسائش کی اعلیٰ صو[illegible] عالم اسلامی کی قابل قدر خدمات انجام دیں [illegible] اسلام کے محسن کہلائے جانے کے مستحق ہیں

اس روح فرسا خبر سے "دار العلوم" کے تمام حلقے غم والم [illegible] اور بتوسط حضرت مہتمم صاحب دار العلوم دیوبند اپنے جذبات غ[illegible] پیغامِ تعزیت کو حضرت معظم ولیعہد نجد و حجاز اور خاندان شاہی کی خدمت میں پیش کر کے دعاء کرتے ہیں اللہ تعالےٰ

سلطان مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور تمام خاندان شاہی اور ارکین حکومت کو صبر جمیل کے ساتھ سلطان مرحوم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ +

دارالعلوم کا تار
ولی عہد نجد و حجاز کے نام

ہز مجسٹی سلطان ابن سعود والی نجد و حجاز کی اچانک وفات کی اطلاع سے مرکز علوم دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ طلبہ، کارکن اور تمام جماعت دیوبند غم زدہ ہیں، سلطان مرحوم عالم اسلام کی بلند پایہ شخصیت اور حامیٔ علم و دین فرمانروا کی حیثیت سے منفرد تھے۔ ہم سب اس عظیم صدمے میں آپ کے شریک ہیں، تمام خاندان شاہی اور ارکین حکومت پیغام تعزیت قبول فرمائیں، ادائے فرض کے لئے آج دارالعلوم میں ختم قرآن شریف کرکے ایصال ثواب کیا گیا اور آج پورے دن کی تعطیل کی گئی +

قونصل جنرل بمبئی کا جواب

آنجناب کا تار ۱۰ نومبر کو موصول ہوا، انا للہ وانا الیہ راجعون آپ کی ہمدردیوں کا بے انتہا شکریہ! آپ کے تار کے مضمون کو ہز مجسٹی بادشاہ سعود ابن عبدالعزیز کی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں۔

(سعودی عرب قونصل جنرل بمبئی)

افریقہ برما اور ہندوستان کے مخلصین سے
ضروری معروضہ

اسی پرچہ میں اطلاع دی گئی ہے کہ پاکستان سے تبادلۂ قوم کا جو انتظام عرصہ سے چل رہا تھا وہ سردست مسدود ہو گیا ہے، اس وجہ سے پاکستان میں ہماری رقمیں بکھر گئی ہیں اور اندیشہ ہے کہ یہ نقصان رسالہ کیلئے ناقابل تحمل ثابت ہو، مخلصین "دارالعلوم" نے رسالہ کی امداد کا | کیلئے غیر معمولی شغف کا اظہار کیا ہے جسکے حق شکر کو ہم ادا نہیں کر سکتے، آج کے دور میں خالص دینی ادارہ [illegible] کہ خطۂ حجاز آج امن و [illegible] اہل توفیق کا تعاون قدم قدم پر مساعدت نہ کرتا تو رسالہ کا باقی رکھنا [illegible] امدی دارہ ہے، اس کا صحیح اندازہ وہی [illegible] ان رسالہ کو پہونچ رہا ہے اس کی تلافی صرف [illegible] سے ممکن ہے کہ ہمارے مخلص ہماری امداد بس کے دور کی بدامنی، قتل و غا اور صرف فرمائیں جنوبی افریقہ کے بہت سے حضرات پر چندہ واجب ہے وہ ہماری پریشانیوں کا کی لوٹ مار اور سرا بلحاظ مروت اپنی رقوم ارسال کریں۔ ہندوستان اور برما کے دوستوں سے گذارش ہے کہ اپنے حلقہ تعارف سے کچھ نظم مملکت ہاتھ میں [illegible] لئے فراہم فرمائیں اور پوری کوشش اس کی فرمائیں کہ نئے خریداروں کے نام وی پی روانہ نہ کرنی پڑے کیا [illegible] سے چندہ وصول کرکے منی آرڈر کے ذریعے بھیجا جائے +

(ناظم رسالہ)